

بر صغیر ما

پاکستان کی علمی و ادبی تاریخ

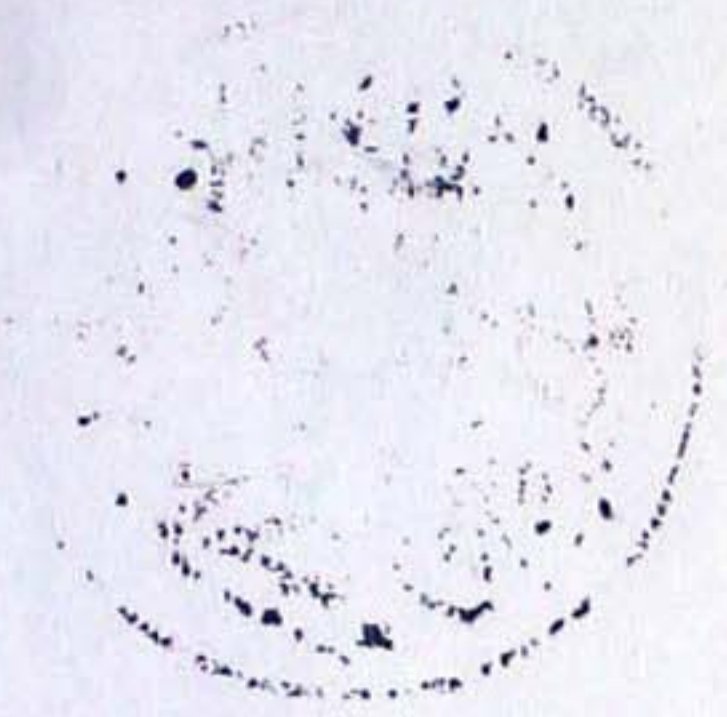
مسئلہ دارالحرب و دارالاسلام کی ایک نیا علمی تحقیق



مُرتبے

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

فہرست



برصغیر



پاک ہند کی شہری حیثیت

مسئلہ دارالحرب و دارالاسلام کی ایک نادر علمی تحقیق

ہر تہ سے

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلامیہ

قاری منسزل، پاکستان چوک، کراچی ۷۴۲۰

جملہ حقوق محفوظ

بر صغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت

مرتب 136006

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام - پاکستان

المخزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی - 74200

۱۹۹۳ء

۱۷۲

..... روپے

ناشر:

طابع:

اشاعت:

صفحات:

قیمت:

ملنے کے پتے

مکتبہ شاہد

۹/۱ علی گڑھ کالونی - کراچی ۷۵۸۰۰

○ المجمعۃ اکیڈمی، محلہ چنگی قصہ خوانی بازار - پشاور

○ مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار - لاہور

○ کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ - راولپنڈی

○ مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ - کوئٹہ

○ کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ - ملتان

○ مکتبہ بنوریہ، نیو ٹاؤن - کراچی

مکتبہ رشیدیہ

قاری منزل، مرار اسٹریٹ، پاکستان چوک، کراچی ۷۴۲۰۰

فہرست

- مرتب ۳۶۵
- دیباچہ
- باب اول:
- ۹ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہندوستان کی شرعی حیثیت
- باب دوم:
- ۳۳ آزاد ہندوستان اور اس کا حکم
- باب سوم:
- ۴۷ ہندوستان کی دستوری حیثیت
- باب چہارم:
- ۵۷ دار اور اس کی قسمیں؛ چند مغالطے اور ان کی وضاحت
- باب پنجم:
- ۹۳ پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت اور اس میں غیر مسلموں کا درجہ
- باب ششم:
- ۱۱۱ اسلامی جمہوریہ پاکستان۔۔۔۔۔ تاریخ کا ایک اہم واقعہ
- باب ہفتم:
- ۱۱۵ ہندوستان اور پاکستان۔۔۔۔۔ نہرو لیاقت معاہدے کی روشنی میں
- باب ہشتم:
- ۱۱۹ پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت مولانا سید محمد میاں مرحوم
- ضمیمہ جات:
- ۱۲۷ ہندوستان کی حیثیت مولانا سید محمد میاں مرحوم
- ۱۳۲ ہندوستان کا تحقیق دار الحرب ہے مولانا رشید احمد گنگوہی

تذکرہ

میرزا محمد علی صاحب

۶۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

۱۰۰۰

دیباچہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

کسی ملک کے باشندوں کے لیے ان کے ملک کی دستوری اور قانونی حیثیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ملک کی قانونی (شرعی) حیثیت ہی اس قوم کے فلسفہء حیات کی روح، اس کے اخلاق کی بنیاد، اس کے فکر کا محور، اس کے عمل کا محرک اور اس کے اشتراک و اتحاد کی اساس ہوتی ہے۔ یہی چیز وطن سے عشق کا وسیلہ بنتی ہے اور یہی عشق وطن کی آزادی اور اس کے دفاع کے لیے سرفروشی اور جان نثاری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے خاک و وطن کا ہر ذرہ قابل پرستش اور دیوتا نظر آنے لگتا ہے۔ اگر کسی قوم میں یہ جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے نہ تو اپنی جان کو جو کھوں میں ڈالتی ہے، نہ اس میں وطن کے دفاع کے لیے سرفروشی کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور نہ وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ سیاسی پر نظر ڈالیں تو ہمیں صاف نظر آجاتا ہے کہ جو اہل ملک اور خصوصاً مسلمان برٹش حکومت کو غاصب اور ملک کو دارالحرب سمجھتے تھے وہی آزادی کی تحریک کے رہنما تھے۔ جن حضرات کے نزدیک مغلیہ عہد حکومت اور برٹش عہد استعمار میں ملک کی قانونی اور شرعی حیثیت میں کوئی فرق نہ تھا اور جن کے نزدیک برطانوی عہد میں بھی برصغیر بہ دستور دارالاسلام ہی رہا تھا، ان کا ملک کی آزادی یا پاکستان کی تحریک سے کچھ تعلق نہ تھا۔

اس حقیقت کا پہلا آشاہ تھا جس نے لیلیٰ وطن کی غلامی کی صبح کو اس کی

حیثیت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس فکر اور جذبے کو قانون کی زبان عطا کی تھی اور ملک کی دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیلی کی طرف اشارہ کر کے تحریک آزادی اور استخلاص وطن کے لیے سعی و جہد کا جواز فراہم کیا تھا۔ اسی مقام پر جہاد و وطن کے لیے پہلا قافلہ، شوق تیار ہوا تھا اور حریت و استقلال وطن کے لیے ایثار و قربانی کا شوق فراوان پیدا ہوا تھا۔ حقیقت کے پہلے آشنا سے میرا اشارہ حکیم الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی کی طرف ہے۔

تحریک پاکستان کی محرک اور مجوز بھی کوئی چیز تھی تو وہ یہی کہ ملک دارالحرب ہو گیا تھا۔ ورنہ اگر مغلیہ عہد سلطنت ہی کی طرح برٹش دور حکومت میں بھی ملک بدستور دارالاسلام تھا تو پاکستان کے لیے تحریک اور اس کے قیام کا کیا جواز تھا۔ دارالاسلام کو ترک کر کے کیا بنایا؟ اگر نظریہ پاکستان کے اولین رہنما سرسید کے بقول انگریزی حکام اولوالامر منکم میں شامل تھے اور ان کی اطاعت مثل اطاعت خدا اور رسول کے مسلمانوں پر واجب تھی اور ملک اس وقت بھی دارالاسلام (اسلام کا گھر اور قلعہ) تھا تو اس دارالاسلام سے روگردانی کو اسلام سے ارتداد اور اسلامی حکومت سے بغاوت سے کم تر درجے کی چیز قرار دیا جاسکتا ہے؟

تحریک آزادی کا کارواں اور تحریک پاکستان کا قافلہ، شوق تاریخ کے مختلف نشیب و فراز سے گزر کر آزادی کی منزل تک پہنچا ہے۔ اس سفر کے کئی مرحلے اور ہر مرحلے کی متعدد منازل ہیں؛

پہلا مرحلہ وہ تھا جب مسلمانوں نے اپنی ہی قوت بازو سے اہل وطن کو آزادی کے ساحل مراد تک پہنچا دینے کا عزم کیا تھا۔ یہ مرحلہ تاریخ تحریک آزادی کے پہلے پچاس سالہ دور پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مرحلے کا آغاز ۸-۱۸۰۷ء میں ہوتا ہے جب حضرت شاہ عبدالعزیز نے ملک کی قانونی حیثیت کے بارے میں دو ٹوک الفاظ میں اس کے

دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ دور ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کی ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں تمام مساعی اور جدوجہد کا مقصد مغلیہ قومی حکومت کا احیاء تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد قافلہ حریت کے سامنے ملکی قومی جمہوری حکومت کا نصب العین نمایاں ہوتا چلا گیا۔ یہ تحریک آزادی کے سفر کا دوسرا مرحلہ تھا۔

پہلے مرحلے کے منازل میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی دعوت اصلاح (۱۸۱۶ء) اور انقلابی تحریک میں اس کی تبدیلی (۱۸۲۱ء)، تحریک جہاد کی ناکامی (۱۸۳۱ء) اور تحریک استخلاص وطن (۱۸۵۷ء) کے واقعات و حوادث پیش آئے تھے دوسرے مرحلے کے منازل دارالعلوم دیوبند کا قیام (۱۸۶۷ء)، انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل (۱۸۸۴ء)، جمعیتہ الانصار (دیوبند) کا قیام (۱۹۰۹ء)، تحریک خلافت کا آغاز اور جمعیت علمائے ہند کا قیام (۱۹۱۹ء) اور اس دوران میں کئی اور قومی و ملکی تحریکات کی صورت میں نمایاں ہوئی تھیں۔

اسی دوران میں استعمار پرستانہ تحریکات بھی پیدا ہوئیں۔ سرسید کی ہجو کیشنل کانفرنس (۱۸۸۵ء) اور پیٹریارک ایوسی ایشن (۱۸۸۸ء) نیز مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس کے ساتھ علی گڑھ کے اہل نظر، بریلی، فرنگی محل، (لکھنؤ) اور بدایوں کے علما، اہل حدیث کی ایک جماعت اور دیوبندی مکتبہ فکر کی خانقاہی جماعت اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ رجعت پرستانہ مراکز اور جماعتیں اپنے اپنے دائروں میں اگرچہ موثر نظر آتی ہیں لیکن دیوبند کی انقلابی جماعت اور کانگریس کی ملکی اور قومی تحریکات کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان کے بہترین دماغ متاثر ہو کر رجعت پرستانہ تحریکات سے الگ اور دیوبند کی انقلابی جماعت اور کانگریس کی قومی تحریکات میں شامل ہوتے رہے۔

اگرچہ یہ قوتیں تحریک آزادی وطن کو روکنے اور کانگریس اور جمعیت علمائے

ہند کے پیش نظر مقاصد سے انھیں ہٹانے میں یکسر ناکام رہیں، لیکن ہندوستان کی تاریخ سیاسی کا ایک مسئلہ ایسا بھی تھا جس میں تنگ نظری یا عدم بصیرت یا اس کی اہمیت کے عدم ادراک نے ملک کی تاریخ کو یکسر پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ مسئلہ ملک کا ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ اول تو متحدہ قومیت کا جوش اس مسئلے کے فہم و ادراک میں مانع رہا اور اگر کسی درجے میں اس کا اعتراف کیا بھی گیا تو اس کی اہمیت کو نہ سمجھا گیا اور اس کے حل کی طرف پوری توجہ نہ دی گئی۔ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور اور پاکستان کی تحریک کے پس منظر میں سب سے اہم یہی مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ تحریک آزادی کے آغاز ہی سے موجود تھا۔ برٹش استعمار نے اسے ہوادی تھی، رجعت پسند تحریکوں اور جماعتوں نے اسے ملک کا پہلا اور سب سے اہم مسئلہ بنا کے اسے عوام کے جوش و جذبات کے حوالے کر دیا تھا اور لیڈروں نے قسم کھالی تھی کہ اب وہ کسی وضاحت، یقین دہانی اور وعدے سے مطمئن اور کسی فیصلہ و قرارداد سے مستفق نہ ہوں گے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی قرارداد اور فیصلے سے مستفق نہ ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ایک فریق کی تنگ نظری اور اس مسئلے کی قرارداد کی اہمیت نہ سمجھنے کی غلطی تھی۔

یہ ایک قطعی غیر فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ اس میں مذہبی جذبات کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں مذہبی زبان، ایک خاص اسلوب اور شرعی قسم کے استدلال سے بھی کام لیا گیا تھا، لیکن کوئی خاص زبان و اسلوب اور استدلال مسئلے کی اہمیت اور نوعیت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ پاکستان کے قیام کا مسئلہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک قطعاً سیاسی مسئلہ تھا اور اس کا ایک خاص سیاسی پس منظر تھا۔

اس مسئلے پر ایک اور طرح سے غور فرمائیے کہ آیا مسلم لیگ ایک مسلمان اور اسلامی جماعت تھی یا ایک قومی جماعت؟ اگرچہ بانی تحریک پاکستان اور مسلم لیگ

کے دورِ آخر کے صدر نے مسلم لیگ کے اندر اور تحریک کے دوران میں اس بحث کو اٹھنے نہیں دیا۔ لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ میں غیر مسلم شامل، اور اس کے صدر بھی ہوئے تھے نیز تحریک پاکستان میں سرگرم تھے۔ بالآخر ۱۹۷۳ء میں لیگیوں کو بھی اپنی تمام آزاد خیالیوں اور نہ چلہنے کے باوجود یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ قادیانی دائرہ اسلام میں داخل نہیں۔ احناف اور اہل حدیث کے نزدیک تو عقائد کا دائرہ اس سے بہت تنگ ہے۔

پاکستان کے مطالبے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز اور قیام پاکستان کا مطالبہ کسی اسلامی عقیدے پر مبنی نہ تھا بلکہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک سیاسی حل تھا۔ جسے غیر مسلموں کی تائید بھی اسی طرح حاصل تھی جس طرح مسلمانوں کی۔ پھر کوئی ایسی سیاسی تجویز اسلامی تجویز کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے زیادہ سے زیادہ تقسیم ملک کی ایک سو پینتالیس تجاویز سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے چالیس غیر مسلم افراد، ادارے یا جماعتیں ہیں، جن میں ہندو، عیسائی اور قادیانی شامل ہیں۔ کیا ان غیر مسلموں نے اس تجویز کی اس لیے تائید کی ہوگی کہ اس تجویز کے مطابق اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ رہا تھا یا یہ تجویز مسلمانوں کے مفاد میں تھی؟ ایسا تو نہ تھا کہ انھوں نے تجویز کے لینے میں اپنے مفاد کی شکل دیکھ لی تھی۔ بالفرض اس میں مسلمانوں ہی کا مفاد تھا اور اس سے اسلامی نظام حکومت کا قیام ہی مقصود تھا تو ہمیں ہندو مہاسبھا، اس کے صدر و سیکریٹری، دوسرے ہندوؤں، عیسائیوں اور قادیانیوں کا ان کی اسلام دوستی، مسلم مفادات کے حصول اور قیام پاکستان کی تحریک میں ان کی تائید کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے اور اگر یہ ہندوستان کے سیاسی فرقہ وارانہ مسئلے کا محض ایک حل تھا جسے بلا تخصیص عقیدہ و مذہب اہل ملک کی ایک کثیر تعداد نے پسند کیا تھا تو ان اصحاب فکر اور

علمائے دین کو اسلام دشمن، ملت فروش، اور ہندو کا ایجنٹ کہنے کا کیا جواز تھا، جنہوں نے اس تجویز کو فرقہ وارانہ مسئلے کا صحیح حل نہ سمجھا تھا اور ان کے نزدیک یہ تجویز مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے بھی خلاف تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں کانگریس اور لیگ دو قومی جماعتیں تھیں کانگریس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اس میں دیگر قوموں اور مذہبوں کے لوگ شامل تھے، وہ ہندو جماعت نہ تھی۔ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس میں غیر مسلم شریک تھے۔ اس کے نام میں "مسلم" کے سوا کچھ بھی مسلم نہ تھا۔ کانگریس اور لیگ کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں تھیں۔ ان میں کچھ استعمار دشمن تھیں، جنہیں ہم انقلابی کہہ سکتے ہیں اور کچھ رجعت پرست اور استعمار کی آلہ کار یا نہ جانتے بوجھتے استعمار کے مقاصد کو فائدہ پہنچانے والی جماعتیں تھیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بجا نہ ہو گی کہ بعض جماعتیں آزادی پسندی اور استعمار دشمنی میں کانگریس کی معاون جماعتوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور خواہ مذہبی ذوق رکھنے والے انہیں پسند نہ کریں، لیکن ان کی حیثیت قومی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ میرا اشارہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کی طرف ہے۔ لیکن ان دونوں پارٹیوں میں بھی ایک بین فرقہ کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ سوشلسٹ پارٹی کی سوچ ملکی تھی وہ صرف ہندوستان میں آئندہ اقتصادی اور معاشی نظام کے بارے میں اپنا خاص فکر اور نقطہ نظر رکھتی تھی۔ اس کے رہنما اور ارکان مذہبی ذوق رکھنے والے نہ تھے، لیکن مذہب کے منکر اور دشمن بھی نہ تھے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی اور اقتصادی فلسفے کی بنیاد مذہب کی نفی پر تھی۔ اس کا آئیڈیل ملک سے باہر تھا، وہ برصغیر کے مخصوص حالات، اس کے باشندوں کے ذوق و رجحان اور مذہب پسندی کے

خصوصیات کو نظر انداز کر کے کیونزوم فلسفے کے مطابق انقلاب لانا چاہتی تھی۔ پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کے نہایت نازک لمحات میں اس نے اپنے جماعتی اور سیاسی کیریئر کا ثبوت نہیں دیا اور عقیدے کے بالکل برعکس لیگ میں شامل ہو کر مذہبی نعرے بازی کی سیاست کو اختیار کر لیا۔ جب اس نے سیاست کا یہ انداز اختیار کیا تھا تو وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو یا مسلم لیگ کو دھوکا دے رہی تھی۔

ہندوستان کی سیاسی اور ملی تاریخ میں جمعیت علمائے ہند کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کا وجود "علماء کی اسمبلی" سے ہرگز مختلف نہ تھا۔ جمعیت علمائے ہند مختلف مکاتب فکر کے علماء کا سب سے بڑا اتحاد تھا، جس میں حنفی، اہل حدیث، لکھنؤ بدایوں، اجمیر، دیوبند وغیرہ کے حنفی علماء کے تمام مقتدر خانوادوں کے علماء شامل تھے برصغیر کی تاریخ میں علماء کا اس سے بڑا اتحاد کبھی قائم نہیں ہو سکا۔ جمعیت علمائے ہند "علماء کی کونسل" تھی، جس کے قیام کی آرزو کا علامہ اقبال نے خواب دیکھا تھا۔ اگرچہ رفتہ رفتہ مقامی اور صوبائی سطح کی جمعیتیں قائم ہو گئی تھیں اور اس کے مقابلے میں بھی انجمن علمایا جمعیت علماء کا قیام عمل میں لایا گیا، لیکن جمعیت علمائے ہند کی مرکزی حیثیت اور اس کی دینی اور سیاسی اہمیت میں فرق نہیں پڑا۔ اس کا سیاسی اور مذہبی کردار روز بہ روز نمایاں ہوتا گیا۔

آزادی سے قبل جمعیت علمائے ہند کی جدوجہد کے کئی اہم اور بڑے دائرے

تھے؛

۱.... آزادی کے لیے جدوجہد۔ اس کے لیے اس نے اپنے پلیٹ فارم سے تحریک چلائی اور دوسری قومی اور ملی انقلابی جماعتوں سے اشتراک عمل بھی کیا۔

۲۔۔۔ مسلمانوں کی ملی ضروریات کا انتظام مثلاً، مذہبی تعلیم، تبلیغ و اشاعت اسلام، اصلاح ملی، تنظیم و اتحاد بین المسلمین، قیام مدارس دینیہ، تنظیم مساجد، اوقاف کا انتظام وغیرہ۔

۳۔۔۔ دستوری مطالبات اور قانون سازی کے میدان میں جدوجہد۔ اس سلسلے میں شاردا ایکٹ، سول میرج ایکٹ، قاضی بل، شریعت بل، خلع بل اور مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلے میں مطالبات، تحفظات، انتظامات وغیرہ

۴۔۔۔ اس کی خدمات کا ایک اہم میدان بین الاقوامی سیاسی خدمات بھی ہیں۔ اگرچہ جمعیت علمائے ہند کے دیوبندی اکابر بہت پہلے سے اس میدان میں سرگرم عمل تھے اور اپنے ایثار اور قربانی کا نقش جمیل تاریخ کے صفحات پر ثبت کر چکے تھے، لیکن جمعیت علمائے ہند کے قیام کے بعد ان کوششوں نے زیادہ منظم شکل اختیار کر لی تھی۔ ان کوششوں میں افغانستان، ایران، مصر، ترکی، عراق و شام، عربستان، حبشہ، مراکش، الجزائر وغیرہ کی آزادی کی تحریکوں، ان مملکتوں کے حدود اور ان کی قومی حکومتوں کے قیام اور حفظ و بقا کی کوششوں اور ان کے خلاف استعماری سازشوں کو ناکام بنانے میں جمعیت نے تحریکیں چلائیں اور اس سلسلے میں اس کے سیکڑوں رہنما اور ہزاروں کارکن جیلوں میں گئے۔

ان مختلف دائروں میں جو جمعیت علمائے ہند کی خدمات کے نہایت جلی عنوانات ہیں، اس کے مساعی اور قربانیوں کا ابھی تک جدید علمی انداز میں کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا کہ مقامی اور ملکی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک اس کی خدمات کا قرار واقعی اندازہ کیا جاسکے۔ میں خود بھی اس وقت اس بحث کو اس سے آگے نہیں لے جاسکتا۔ میں اس وقت جمعیت کی طرف ان کوششوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو اس نے ملک کی تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ دستوری اور قانون سازی کی سطح پر کی ہیں۔

جمعیت علمائے ہند نے اپنی زندگی کے آغاز ہی میں اندازہ لگایا تھا کہ ملک کا آئندہ جو دستور بھی بنے گا، وہ جمہوری بنیادوں پر بنے گا۔ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کی ناکامی نے مغلیہ حکومت کے احیاء یا کسی قسم کی مسلمان حکومت کے قیام کو خارج از امکان قرار دے دیا تھا۔ سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ قوم کو آئندہ کسی نئے غلبہ و استبداد سے بچایا جائے اور ملک میں ایسی دستوری اور جمہوری حکومت کا قیام ممکن بنایا جائے جو مسلمانوں اور ملک کی دیگر اقلیتوں کے اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہو۔ یہ نقطہ نظر صرف جمعیت علمائے ہند ہی کا نہ تھا، بلکہ تمام ملی انقلابی جماعتوں، مسلمان کانگریسیوں اور آزاد خیال اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا بھی یہی خیال تھا۔ اگرچہ اس جدوجہد میں بہت مشکل مقام آئے اور ۱۹۳۷ء خصوصاً ۱۹۴۰ء کے بعد مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ و انتہا پسندانہ اندازِ سیاست نے تو اس منزل کو بہت دور کر دیا تھا جب کہ مسلم لیگ کے صدر نے ایک بیان میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمیں پاکستان دے دو اور ہندوستان میں تم بہ خوشی ہندو راج قائم کر لو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد دنیا کی تیسری بڑی مسلمان اکثریت کو، جو ایک خطہ زمین اور ایک ملک کی سرزمین میں آباد تھی، کسی نئے دستوری یا سیاسی استبداد کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا (۱)۔ جمعیت علمائے ہند نے شروع ہی سے اپنے دستوری نصب العین کا تعین کر لیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اسی نصب العین کو پالینے کی جدوجہد میں مصروف رہی۔

(۱) انڈونیشیا دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے لیکن اس کی آبادی تیرہ کروڑ ہے۔ زیادہ نہیں بنگلہ دیش کی آبادی بارہ کروڑ اور پاکستان کی آبادی دس کروڑ سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا دعوا ہے کہ ان کی تعداد بیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہے۔ جب کہ راجیو حکومت نے تقریباً سولہ کروڑ آبادی تسلیم کر لی تھی۔ اس لیے مسلمان آبادی کا سب سے بڑا ملک، جہاں مسلمان آزاد اور حکومت کے کاروبار میں برابر کے شریک ہیں، ہندوستان ہے۔

جمعیت کی تاریخ میں ہمیں سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ جب اس نے لالہ جیت رائے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مرتبہ "میشاق ملی" کو اپنے مقاصد سے قریب پا کر اس پر اظہار رائے کیا تھا۔ یہ میثاق ملی کانگریس کی ایک سب کمیٹی نے تیار کیا تھا اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں خصوصی اجلاس کانگریس منعقدہ دہلی کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کے فیصلے کے مطابق چھاپ کر مختلف جماعتوں کو بھیجا گیا۔ اس میثاق ملی کی ایک شق میں کہا گیا تھا:

"تمام ملتوں کو جن سے قوم ہند مرکب ہے، کامل مذہبی آزادی یعنی آزادی عقائد، عبادت، تبلیغ، اجتماع اور تعلیم حاصل ہوگی اور یہ آزادی ایک ایسا آئینی حق ہوگا جس کی ترمیم، تسخیر، معطلی یا اس میں کسی نوع کی مداخلت کسی حکومت کے لیے جائز نہ ہوگی۔ (جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۱۶۹)

اگرچہ پورے میثاق ملی پر غور کر کے آخری رائے دینے کے لیے جمعیت علمائے ہند نے نو (۹) اہل علم اور اصحاب فکر و نظر کی ایک سب کمیٹی بنا دی تھی لیکن مذکورہ بالا شق کو پسند کیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں جمعیت علمائے ہند نے خود اپنا ایک فارمولا پیش کیا، جس کی پہلی شق یہ تھی:

"ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی ادارے، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔"

(جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۲۷۴)

۱۹۳۲ء میں پھر ایک قرارداد میں جمعیت علمائے ہند نے اپنے دستوری نصب العین کو پوری طرح واضح کیا اور کہا:

"وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ

کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔“

(جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۳۳۳)

یہی مطالبہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے چودھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۴۔

مئی ۱۹۳۵ء بہ مقام دہلی میں دہرایا اور اس میں مندرجہ ذیل مزید ایک شق کا اضافہ کیا:

”مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۲/۳

اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخالفانہ اثر

انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔“

(جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۳۶۳)

کانگریس اپنے آغاز قیام ہی سے ایک قومی جماعت کی حیثیت سے ملکی اور قومی

مفادات اور غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل تھی۔ اپنی تاریخ

کے مختلف ادوار میں ملک کے لیے ایک جمہوری اور غیر مذہبی (secular) دستور کے

باب میں اپنے نصب العین کا اعلان کرتی رہی تھی، سب سے پہلے اس نے اپنے

پینتالیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی (۲۹۔ مارچ ۱۹۳۱ء) میں بنیادی حقوق کے

بارے میں ایک قرارداد پاس کی۔

(دوبارہ) سینتالیسویں اجلاس منعقدہ کلکتہ (اپریل ۱۹۳۳ء) میں بنیادی حقوق

وفرائض اور معاشی پروگرام پر ایک جامع قرارداد پاس کی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں

سریج بہادر سپرو کے زیر صدارت ایک کمیٹی میں بنیادی حقوق کا مسئلہ زیر بحث آیا کہ

مستقبل کے ہندوستانی آئین میں اسے کیا جگہ دی جائے؟ اس قرارداد نے پہلی مرتبہ

شہری حقوق اور معاشی حقوق میں امتیاز کیا۔ شہری حقوق کو عدالت کے ذریعہ نافذ کیا

جاسکتا ہے، جب کہ معاشی حقوق کو عدالت کے ذریعے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں کمیٹی نے سوشل ماحول اور معاشی حالات کو تبدیل کرنے کے

لیے مثبت انداز میں منصفانہ قانون سازی اور دستور میں دونوں قسم کی دفعات کو جگہ

دینے کے لیے سفارش کی۔

(Federal India : A Design for Change, by

Rasheeduddin Khan, New Delhi (India), 1992, P.70)

۱۹۴۵ء میں کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں ایک بار پھر اپنے مقاصد اور مستقبل میں ملک کے سیاسی نظام کے بارے میں اپنے نصب العین کا اعادہ کیا اور ملک کے عوام کو یقین دلایا:

”اب جب کہ گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کے ذریعے سیاسی آزادی حاصل کی جا چکی ہے نیشنل کانگریس کا فرض ہے کہ وہ سماجی اور معاشی آزادی کے لیے جدوجہد کرے، تاکہ ہندوستان کے تمام لوگوں کے لیے بلا لحاظ نسل و مذہب یکساں مواقع فراہم ہوں۔ یہ مقصد ایک نئے اور مثبت طریق کار اور مادر وطن کی خدمت کے لیے تعمیری اسپرٹ کا متقاضی ہے۔

ہندوستان کے عوام نے آزادی حاصل کر لی ہے، لیکن اس کے ثمرات سے مستفیض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔ کانگریسیوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کی خدمت ان کا نصب العین رہا ہے اور اب بھی ہے اس لیے وہ بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریاں نبھائیں۔ ۰۰۰

ہندوستان کے لوگوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا۔ ۰۰۰ طبقاتی فرق مٹا دینا، جو پیدائش، فرقے یا مذہب کی بنا پر ہے، سب سے بڑی خدمت ہے۔ ایسا کر کے غیر طبقاتی جمہوری سوسائٹی قائم کی جاسکے گی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی اقدار کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا ہر قیمت پر خاتمہ کرنا ہے۔

(Selected Works of Maulana Abul Kalam

Azad, Edited by Dr. Ravindra Kumar,

Vol.3, New Delhi (India) 1991, P.280)

اس کے باوجود کہ ملک کی تقسیم نے جمہوری غیر مذہبی دستور کی منظوری اور

نفاذ میں بہت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ لیکن جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے آزاد خیال اور نیشنلسٹ رہنماؤں نے کانگریس کو اپنی اعلان کردہ پالیسی سے ادھر ادھر ہٹنے نہیں دیا اور انھیں رہنماؤں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے اپنے ابتدائی ایام ہی میں دستور کی نوعیت کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ اس کی حیثیت سیکولر (غیر مذہبی) ہوگی۔

کانگریس کی قراردادوں کے مطابق ۱۹۴۷ء کے شروع ہی میں دستور سازی کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اولاً دستور ساز اسمبلی نے دستور سازی کے رہنما اصول طے کر کے ڈاکٹر بی۔ آر۔ اے۔ ابید کر کی صدارت میں ایک ڈرافٹنگ کمیٹی بنا دی۔ ۴۔ نومبر ۱۹۴۸ء کو اس نے پہلا مسودہ قانون دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا اور اس کی ہدایات کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کے بعد دستور کو آخری شکل دے دی گئی۔

”۲۶۔ نومبر ۱۹۴۹ء تک اسمبلی کا کام جاری رہا۔ مجلس دستور ساز نے دو سال گیارہ ماہ اٹھارہ دن میں بھارت کا دستور بنایا۔ اس دستور بنانے پر حکومت کا ۶۳ لاکھ روپے خرچ آیا۔ یہ دستور ۲۲ حصوں میں مرتب ہوا۔ اس دستور کی رو سے آزاد بھارت اعلیٰ اختیار رکھنے والا غیر مذہبی جمہوری اور دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا۔

(مولانا آزاد۔۔۔۔ ایک سیاسی ڈائری، مرتبہ: اثر بن یحییٰ انصاری، ص ۴۴۴)

”ڈاکٹر ابید کر دستور بنانے والی کمیٹی کے صدر تھے۔ دستور کے شروع میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم باشندگان ہند نے اپنے ملک کو ایک مکمل اور موثر جمہوری مملکت بنانے، اس کے تمام شہریوں کو اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل کرنے، اظہار خیالات، عقیدہ، مذہب اور عبادت کی آزادی عطا کرنے، سب کو یکساں معاشی مواقع حاصل کرنے، نیز ان میں شخصی وقار اور قومی اتحاد قائم کرنے اور اخوت بڑھانے کے واسطے ہندوستان کو آئینی طور پر ایک اعلیٰ جمہوریت میں تشکیل دینے کے لیے مستحکم

ارادہ کر کے اپنی اساسی دستور ساز اسمبلی میں اس آئین کو دل سے قبول اور منظور کرتے ہیں۔ اس طرح یہ آئینی اور غیر مذہبی دستور منظور ہو گیا۔

(حسرت موہانی۔۔۔ ایک سیاسی ڈائری، مرتبہ: اثر بن مکی انصاری، ص ۲۷۹)
دستور کی منظوری کے کامل دو ماہ کے بعد ۲۶۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو ملک میں یہ دستور نافذ کر دیا گیا۔

”۲۶۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو خود مختار ہندوستان اور غیر مذہبی آئینی دستور کا نفاذ ہونے پر ہندوستان کے پہلے صدر بابو راجندر پرشاد چنے گئے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو کا از سر نو انتخاب عمل میں آیا اور ان کی نئی کا بنیہ نے حلف اٹھایا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیاں بجاے گئے۔ اس طرح ہندوستان نے اپنی مکمل آزادی اور غیر مذہبی جمہوری نظام کے قیام کا اعلان کر دیا۔“

(مولانا آزاد۔۔۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۴۶)

ڈاکٹر رشید الدین خان (دہلی) لکھتے ہیں:

”موجودہ ہندوستانی ریاست ایک عظیم الشان تاریخی جدوجہد کے بعد وجود میں آئی ہے۔ یہ شہریوں کا ایک اشتراک (Association) ہے، جس میں ہر شہری برابر اور آزاد ہے اور ذات، عقیدہ، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، سکونت (Domicile)، مرتبے کے امتیاز کے بغیر مساوی حیثیت میں اس کا رکن ہے۔ ہندوستانی ریاست نہ تو مذہبوں کا وفاق ہے اور نہ مذہبی فرقوں کا مجموعہ ہے۔ ہندوستان کے تمام شہری قانونی اور آئینی اعتبار سے ایک عام متحدہ قومی معاشرتی ریاست کے عناصر ترکیبی ہیں۔“

”موجودہ ریاست کی بنیاد ایک دستور ہے جو بنیادی، غیر مذہبی (Secular) اور انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس لیے ایک اسٹیٹ کو اسٹیٹ کے طور پر اور ایک سکولر اسٹیٹ کو سکولر اسٹیٹ کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ نہ اس سے کچھ کم، نہ اس سے کچھ زیادہ۔“

(Federal India : by Dr. R.D. Khan, P.70)

جب تک ہندوستان نے اپنے غیر فرقہ وارانہ، جمہوریہ اور سیکولر ہونے کا اعلان اور اس کے بعد دستور نافذ نہیں کر دیا، ہندوستان کی اقلیتیں، خصوصاً مسلمان ایک سخت بے چینی میں مبتلا رہے تھے۔ دستور کے نفاذ کے بعد انھیں ہندوستان میں اپنی حیثیت اور اپنے مذہب، تہذیب، پر سنل لاکی طرف سے اطمینان ہوا۔ اگرچہ اب بھی انھیں تنگ نظری، فرقہ پرستی، تعصبات کا سخت سامنا ہے، لیکن ہندوستان کا غیر فرقہ وارانہ غیر مذہبی دستور ان کے لیے ایک ڈھال ہے۔

ہندوستان کے دستور کے سلسلے میں سیکولر اسٹیٹ کے لفظ نے مذہبی ذوق رکھنے والوں کو متوحش کر دیا تھا۔ لیکن جب دستور میں سیکولر اسٹیٹ کا لفظ استعمال کیا جا رہا تھا تو یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہندوستان میں سیکولر ازم مذہب کے خلاف انداز فکر پر منطبق نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق صرف عقیدے اور ضمیر کی آزادی سے ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ”ہندوستانی نقطہ نظر سے سیکولر ازم کی دوسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ ہندوستانی سیکولر ازم کا مطلب ہے؛

”تمام مذاہب کی یکساں عمت۔“ (Federal India ---- P.72)

اور یہ کہ

”تمام مذاہب کے معاملے میں ریاست کی غیر جانبداری۔“

(Selected Works of Maulana Abul Kalam Azad,

Edited by Dr. Ravindra Kumar,

Vol.2, New Delhi (India) 1991, P.123)

اس غیر فرقہ واری جمہوری غیر مذہبی دستور نے فیصلہ کر دیا کہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں ہندوستان میں پابند اور مجبور اقلیتیں نہیں۔ وہ اس ملک میں برابر کی شہری ہیں اور خواہ ان کی تعداد اس ملک میں کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو، وہ اس ملک کی

اسی طرح مالک ہیں، جس طرح ملک کی کوئی دوسری قوم اور اکثریت مالک ہو سکتی ہے ملک کی قسمت کا کوئی فیصلہ ان کی رائے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی عظمت کا ہیكل ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب ان کی آزادی اور ہمہ قسم کے حقوق کسی حکومت کے بخشے ہوئے نہیں یا کسی قابض و استبداد کی ان کے لیے رعایت نہیں، بلکہ ان کا قانونی حق ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو کاغذوں میں لکھ دی گئی ہو اور دستور ہند نامی دستاویز کی زینت بنا دی گئی ہو لیکن عملی دنیا میں اس کا اعتراف نہ کیا گیا ہو۔ اس کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے، چنانچہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق:

”۱۲۔ مئی ۱۹۵۰ء کو پٹیالہ یونین کے ۲۵ ہزار مسلمان جنھیں ۱۹۴۷ء میں فساد کی وجہ سے ہندو بنا لیا گیا تھا، وہ دوبارہ مسلمان ہو گئے اور حکومت ہند نے انھیں نئے سرے سے پٹیالہ یونین میں بسانے کا کام شروع کر دیا۔“
(روزنامہ خلافت بمبئی، ۱۲۔ مئی ۱۹۵۰ء، بہ حوالہ ”مولانا آزاد۔۔۔۔۔ ایک سیاسی ڈائری“، ص ۲۵۳)

اس جمہوری غیر مذہبی دستور کا نتیجہ تھا کہ سردار ولجھ بھائی پٹیل نے ہندو راج کا مطالبہ کرنے والوں کو مستنبہ کیا۔ خلافت بمبئی کے مطابق:

”۲۔ اگست ۱۹۵۰ء کو دہلی میں وزیر داخلہ سردار پٹیل نے پنڈت کنزرو (H.N. KUNZRU) کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ ملک میں شہری آزادی پر پابندی نہیں ہے۔ میں یہ ثابت کرنے کو تیار ہوں کہ ملک کا ایک طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہے کہ اس نے گاندھی جی کو قتل کر ڈالا، بلکہ ہندو مہاسبھا کے سابق صدر مسٹر بھوپتکر کے ایک ساتھی نے مجھے مطلع کیا کہ یہ طبقہ وزیر اعظم ہند کو بھی قتل کر ڈالنا چاہتا ہے۔ مسٹر بھوپتکر جلتے ہوئے بنگال پر تیل چھڑک کر ملک میں امن کو برباد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم ہندو راج اور برہمن راج کے مدعیان کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔“

(روزنامہ خلافت، بمبئی - ۱۳ - اگست ۱۹۵۰ء، بہ حوالہ "مولانا آزاد ---)

ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۵۸)

پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس نے ۲۰ - ستمبر ۱۹۵۰ء کو ناسک میں کانگریس

کے ستاونویں سالانہ اجلاس کے خطبہ، صدارت میں کہا:

ہم پاکستان کے قیام کو تو نہ روک سکے، لیکن ہندوستان میں ہماری

پالیسی ہندو، مسلمان، سکھ، بدھی، جین، پارسی اور عیسائی میں امتیاز نہیں

کرتی..... ہمارے دستور کے تحت ہماری حکومت غیر مذہبی ہے۔ اس میں ہر

شہری کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی شرافت اور دور اندیشی

کا ثبوت ہے۔" (مولانا آزاد --- ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۶۳)

۱۱۔ اکتوبر کو صدر کانگریس بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے دہلی سے شائع ہونے

والی ایک اپیل میں ہندوستان کی غیر مذہبی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان میں کسی مذہبی کتاب پر کوئی حکومت قائم نہیں کی جاسکتی

کیوں کہ یہاں بہت سی مذہبی کتابیں موجود ہیں۔ لہذا مذہبی حکومت کے قیام کا

مطالبہ ہندوؤں کی آپس میں خانہ جنگی کا باعث ہو جائے گا۔ اس لیے کہ وہ خود

مختلف کتابوں کے پیروکار ہیں۔ چنانچہ یہاں تمام مذہبی فرقوں کو مذہبی

آزادی حاصل ہے۔"

یہاں ہم نے سردار پٹیل اور بابو ٹنڈن کے بیانات کو پیش کیا اس لیے کہ

انہیں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں غیر سنجیدہ کہا جاتا ہے۔ شاید ایسا ہی ہو،

لیکن ہندوستان کے بارے میں ان کے اخلاص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان بیانات میں

انہوں نے صاف لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان کے لیے غیر

فرقہ وارانہ غیر مذہبی دستور ہی مناسب تھا۔ اس کے سوا کسی خاص مذہبی کتاب اور فلسفے

کی بنیاد پر کوئی نظام بنایا اور چلایا نہیں جاسکتا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس جمہوری دستور کی تیاری میں مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

”بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر کھوتانہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اس کی بنیاد ہی پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ، اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام، یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیش نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔“

اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے، مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اس کو رائے دینے کا حق ہو گا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندے کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کے ذریعے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہو گا اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی۔ اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہو گا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

اب نیچے مذہبی آزادی! اس سلسلے میں دستور اعلان کرتا ہے کہ:

۱۔۔۔۔ ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (Conscience) کی آزادی کا حق ہو گا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہو گا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اس

کی تبلیغ کریں۔

۲..... ہر مذہبی فرقے یا طبقے کو اس کا حق ہو گا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی

خاطر؛

الف: ادارے قائم کریں اور چلائیں۔

ب: مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں۔

ج: اس ادارے کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔

د: اور اس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں۔

(The Constitution of India,

Part. III, Article 25, 26.)

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے
نمائندوں کی طرف سے ان کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔
چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا:

”جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو

ان کے ساتھ دو قالب و یک جان بنادے گا۔“

ایک اور صاحب نے کہا:

”میں اکثریتی فرقے کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اقلیتی

فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔“

(Constitutional assembly debates,

Vol. VII, pp.260-67.)

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد
و اعمال اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ
”حکومت مذہب کے معاملے میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت
کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے، ان میں کسی مذہب کی تعلیم کا
بندوبست نہیں ہوگا۔“

(The constitution of India,

Part III, Article 28.)

(برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت، ص ۴۸-۴۹)

دستور ہند کی اس غیر فرقہ واری جمہوری اور سیکولر حیثیت کا اعتراف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بھی فرمایا۔ لیکن حضرت نے مسلمانوں کو متنبہ بھی فرمادیا کہ مسلمانوں کو اپنے بہت سے مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی کام خود ہی انجام دینا ہوں گے اس کے لیے ہمیں سیکولر اسٹیٹ سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن (اپریل ۱۹۵۱ء) میں اپنے خطبہء صدارت میں فرمایا:

”ان تباہیوں اور بے پناہ مشکلات کے باوجود جو تقسیم ہند کے بعد برداشت کرنی پڑی ہیں، یہ بات قابل اطمینان ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا اقتدار اعلیٰ (High Command) اپنے نظریات کے محور سے نہیں ہٹا گا۔ گاندھی جی کی قربانی ایک کھلی حقیقت ہے۔ پنڈت ہنر، مولانا آزاد، راج گوپال اچاریہ جیسے گاندھی جی کے ساتھیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ انڈین یونین کا دستور اساسی (Constitution) جمہوریت اور غیر فرقہ واریت کے اصول پر وضع کیا گیا۔“

یہ بات قابل مسرت ہے کہ یہ ”دستور“ ہندوستان کے ہر ایک باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے، بلا اختلاف مذہب و ملت ہر ایک کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر ایک ملت کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقا و تحفظ اور ترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ اس لیے اس دستور کے بموجب ذمہ داری خود ہمارے اوپر آتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ہم اس کو انجام دیں۔

جمہوری دستور ساری ذمہ داری جمہور پر ڈالتا ہے، جمہوریہ کی حفاظت اور ترقی جمہور کا فرض ہے۔ جمہور کی اصلاح جمہوریت کی درستی ہے۔

جمہور کی شائستگی، سرگرمی اور ایثار سے جمہوریہ ترقی کرتا ہے۔ آج مسلمانوں پر جمہوریہ ہند کا اہم عنصر ہونے کے لحاظ سے کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کو وہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں، کہاں تک اس ذمہ داری کو انجام دے چکے ہیں اور آئندہ انہیں کیا جدوجہد کرنی ہے؟ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان تمام باتوں پر غور کریں اور جس ملک کا ایک بازو ہونے کی حیثیت سے، ہمارے ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں، ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے آثار و معابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کو ترقی کے راستہ پر کس طرح لگا سکتے ہیں، کیا کیا مشکلات سنگ راہ ہیں اور ان کو رفع کرنے کی کیا صورتیں ہیں؟ غرض کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی "تعمیر جدید" میں اپنی حیثیت اور تاریخی عظمت کے مطابق ان کا حل تلاش کرنا جمعیت علمائے ہند کا فرض ہے۔"

(خطباتِ صدارت، ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم - گوجرانوالہ،

۱۹۹۰ء، ص ۲۶-۲۲۵)

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت کے

خطبہ صدارت میں بھی ہندوستان کے سیکولر دستور اور مسلمانوں کے فرائض کے سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا:

ہماری ماضی بعید تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔ ماضی قریب

دورِ غلامی اور اب نو سال سے آزاد مملکت میں نوزائیدہ جمہوریہ کا تجربہ کر رہے

ہیں۔ ہم اس آزاد مملکت میں باعزت شہری بن کر رہیں یا پس ماندہ اور از

پافتادہ، خود فراموش و معاذ اللہ خدا فراموش بن کر زندگی گزاریں، یہ ہمارے

فکرِ صحیح، فراست، بیدار مغزی اور ہمارے عمل اور کردار پر موقوف ہے۔

کوئی بھی صحیح الحواس پس ماندگی کو پسند نہیں کر سکتا۔ ہر ایک سلیم الفطرت پس

ماندگی کی ذلت و خواری کو موت سے بدتر سمجھتا ہے۔

مگر عزیزان محترم! جب تک سعی مجہم اور جدوجہد کی روشنی نمایاں نہ

ہو۔ پس ماندگی کی تاریکی کو چھانٹنا نہیں جاسکتا۔

پس ماندگی ظلمت و تاریکی ہے اور جدوجہد نور اور روشنی۔ جب بھی کوشش اور سعی و محنت کی روشنی دھیمی پڑتی ہے، پس ماندگی کی تاریکی ابھر آتی ہے آپ اگر پس ماندگی کی تاریکی ختم کرنا چاہتے ہیں تو صراطِ مستقیم پر جدوجہد کی روشنی تیز کر دیجیے۔ دنیا کا کام ہو یا دین کا، جماعتی ہو یا انفرادی۔ ہر ایک کے لیے قانون قدرت یہی ہے۔

لیس للانسان الاماسعی "انسان کو وہی ملتا ہے جو اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ اللہ رب العالمین کا فضل و احسان اور اس کی بخشش ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم کا پیکر زیبا عطا فرما کر خلعتِ خلافت سے نوازا۔ بروبحر پر اس کے اقتدار اور اس کی عظمت کا جھنڈا اہرا کر و لقد کر منا کی سند عطا فرمائی۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ عمل صالح اور عمدہ کردار سے اس جھنڈے کو سر بلند رکھتا ہے یا اپنی بے عملی سے اس کو سرنگوں کر ڈالتا ہے۔

عزیزان محترم! ہندوستان جیسے مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے گہوارے میں جمہوری نظام حکومت کے لیے دو ہی اصول ہو سکتے تھے۔ سب مذہبی یا لامذہبی؟

ہندوستان کے لیے دوسرا اصول یعنی لامذہبی جمہوریہ ہی طے کیا گیا ہے یعنی ایسا جمہوریہ کہ نہ اس کی دستور ساز و قانون ساز مجالس میں مذہب کے نام پر نمائندگی ہو اور نہ نظام حکومت کسی مذہب یا فرقہ کا جانبدار ہو۔ تمام فرقے اس کی نظر میں صحیح معنی میں یکساں ہوں۔ کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس سے اقلیت اور اکثریت کے نفرت انگیز احساس کو ختم کیا جاسکتا ہے اور یہی ایک صورت ہے جو اقلیتوں کے دماغ سے احساس کمتری دور کر کے ان کو اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھانے پر آمادہ اور ان کے افراد کو روشن مستقبل کی توقع دلا کر ترقی کے رستے پر تیز گام کر سکتی ہے۔

لیکن اس صورت میں کسی بھی ملت اور فرقہ کو اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور ترقی کے لیے سیکولر جمہوریہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا اور اپنی

جدوجہد کو اس کی امداد پر موقوف رکھنا، سیکولر جمہوریہ کے بنیادی تصورات سے انحراف ہے اور ایسا غلط اعتماد اور ایسی بے محل توقع ہے کہ اس کے لیے "خواب پریشاں" یا "نقش برآب" کا لفظ ہی موزوں ہو سکتا ہے۔

بہر حال سیکولر جمہوریہ کو سیاسی لحاظ سے آپ کتنا ہی قابل اطمینان اور باعث مسرت محسوس کریں، مگر یہ اطمینان کبھی بھی نہ ہونا چاہیے کہ وہ آپ کے علوم، آپ کے مذہب اور آپ کی روایات کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اپنے علوم، اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کی حفاظت خود ہمارا اپنا فرض ہے اور اس فرض کو صرف ہمیں ہی انجام دینا ہے۔ سیکولر جمہوریہ کا امانت دار فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ ہماری کوشش میں رکاوٹ نہ ڈالے اور ہو سکے تو مناسب حالات میں ترقی کے مواقع پیدا کرتا رہے۔ سعی بہم بہر حال اہل ملت کا فرض ہے۔ اگر مثال پیش کرنے کی اجازت ہو تو میں سیکولر جمہوریہ کو ایک زر خیز زمین سے تشبیہ دوں گا۔ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ تخم عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تخم پاشی اور آبیاری بہر حال کاشتکار کا فرض ہے۔ ملوکیت میں وہ عمل بار آور ہوتا ہے جو خوشنودی شاہ کے لیے ہو۔ جمہوریت میں وفاداری کی یہ جنس ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں وہی عمل بار آور ہوتا ہے جو جمہور اور جمہور کے وطن عزیز کے لیے ہو۔"

(خطباتِ صدارت، ص ۶۶-۶۷)

ہندوستان کا دستور وہاں کے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر مسلط نہیں کر دیا گیا تھا۔ وہ اس کے بنانے میں شریک رہے تھے۔ وہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں کہ اس میں کوئی غلطی اور خامی نہ ہو اور ایسا بھی نہیں کہ اب اس کی کسی خامی کی اصلاح نہ ہو سکتی ہو، بلکہ اسی دستور کے مطابق ملک کے عوام کا یہ حق محفوظ ہے کہ جن ہاتھوں نے اسے بنایا ہے۔ وہ ہاتھ اس میں ترمیم و اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔ ملک و قوم کے مشترک مقاصد کے حصول میں یہ دستور ہمیشہ مشعل راہ کا کام دے گا۔

کسی دستور کی موجودگی کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہوتا کہ سوسائٹی برائیوں اور

ناانصافیوں سے پاک ہو گئی ہے۔ سوسائٹی میں برائیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن ایک اچھا دستور برائیوں کے انسداد میں معاون ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی برائیوں نے ہندوستان کی اقلیتوں اور مسلمانوں کو بہت بے چین کر دیا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ مذہبی تعصبات اور فرقہ پرستی، جس کے انسداد کا دستور ہند میں خاص خیال رکھا گیا تھا، اکثریت کے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار بن گئی ہے، اس کی ہلاکت خیزیوں کی داستان بہت طویل ہے۔ اقلیتیں اس کی ضربات شدیدہ سے چیخ اٹھی ہیں۔ بعض عدالتی فیصلوں کو مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق اور پرسنل لا میں مداخلت قرار دیا ہے۔ بابرئ مسجد کے انہدام کا سانحہ بنیادی مذہبی حقوق اور ان تحفظات کے خلاف اور ہندوستان کے سیکولر کیریئر پر ایک نہایت بدناما دہا ہے، جس سے مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے۔ سیکڑوں ناانصافیوں کی مثالیں عوام کی زبانوں پر ہیں۔

یہ ضمانت بھی نہیں دی جاسکتی کہ آئندہ اس قسم کے واقعات پیش نہ آئیں گے، لیکن ہندوستان کے اسی دستور نے بنیادی حقوق کے غصب کے خلاف آواز بلند کرنے، سماجی ناانصافیوں کو چیلنج کرنے اور ظلم کے خلاف کبھی سر نہ جھکانے کا حق دیا ہے۔ ہندوستان کے سیکولر دستور کے تحت ظلم اور ناانصافیوں کی مثال پاکستان کے حالات کے آئینے میں دیکھ کر ہم ایک متوازن اور منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے دستور میں مختلف صوبوں کے حقوق متعین ہیں۔ لیکن صوبوں کے عوام اور رہنما مرکز کے قبضہ و تسلط اور ناانصافی کے خلاف چیخ رہے ہیں۔ دستور میں قتل، غارتگری، لوٹ مار، دہشت گردی، چوری، ڈاکہ، ناانصافی، طبقاتی استحصال کے خلاف اسلامی تعلیمات اور دستوری دفعات، تمام طبقات و افراد کے لیے ترقی کے یکساں مواقع کی ضمانت، جرائم کی سزائیں موجود ہیں لیکن سوسائٹی میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی دستور اجازت نہیں دیتا۔ اور جو دستور کا منشا و مقصود ہے، وہ سوسائٹی میں نظر نہیں آتا۔ معاشرتی ناانصافیاں اور طبقاتی استحصال عروج پر ہیں، کمزور طبقات پر مظالم اتہا

کو پہنچ چکے ہیں، عوام بلبلا رہے ہیں اور انسانیت کراہ اٹھی ہے۔ لیکن ان تمام ناانصافیوں، مظالم اور استحصال کے لیے ہم پاکستان کے دستور اور اسلامی تعلیمات پر مبنی اس کی دفعات کو الزام نہیں دے سکتے۔

ہندوستان کا سیکولر دستور مسلمانوں کے حقوق اور ان کے پرسنل لا میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی دو تہائی اکثریت کسی ایسی قانون سازی کے خلاف متحد اور ایک آواز ہو لیکن اگر مسلمانوں کے نمائندے اور ان کی دو تہائی اکثریت ہی اپنے حقوق اور پرسنل لا میں مداخلت کا راستہ کھول دے تو اس کا شکوہ کس سے کیا جائے گا۔ اس کا ثبوت ماضی بعید میں سول میرج، شاردا ایکٹ کے پاس کرانے اور شریعت بل، قاضی بل وغیرہ کی مخالفت میں محمد علی جناح اور سر محمد یامین خان اور لیجس لیٹو کو نسل میں لگی نمائندوں کے رویوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ خود پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ درجنوں ایسے قوانین کی نشان دہی کی گئی ہے جس کا نہ صرف اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعض قرآنی اور اسلامی تعلیمات کے صریح خلاف ہیں۔ لیکن یہ سب مسلمانوں کے بنوائے ہوئے ہیں۔ حالیہ مثالوں میں نفاذ شریعت بل اس کی بہت بڑی مثال ہے۔ محمد نواز شریف کے دور حکومت میں پارلیمنٹ نے شہریوں کے نام پر جو بل پاس کیا تھا، وہ شریعت کے نام پر ایک فراڈ تھا۔ یہ فراڈ ایک مسلمان حکومت نے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس بل کو پاس کرانے والی ایک جماعت کے رہنما نے اسے نفاذ شریعت بل کے بجائے انسداد شریعت بل قرار دیا تھا۔ اگر مستقبل میں پاکستان یا ہندوستان کی دستوری ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے ایسے ہی نمائندے پہنچ جائیں تو شریعت حقہ اور اس کے ناموس کو ان کی آزاد خیالیوں اور تجدد پسندیوں کے نتائج فاسدہ سے کیوں کر بچایا جاسکتا ہے!

مذہبی نقطہ نظر سے کسی دستور کے بارے میں دوہی باتیں کہی جاسکتی ہیں؛ یہ کہ دستور اسلامی ہے یا نہیں؟ لیکن کسی دستور کے اسلامی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خلاف اسلام بھی ہے! اگر کسی ملک کے عوام اپنے سیاسی، معاشی، ملکی، شہری ترقیاتی، دفاعی مقاصد کے حصول اور تحفظ کے لیے کوئی دستور بنا لیتے ہیں، تو یہ بات خلاف اسلام نہیں۔ خالص دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے بھی کسی ایسے معاہدہ میں شرکت اسلامی تعلیمات اور قانون شریعت سے متصادم نہیں۔ پھر ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں، عددی اعتبار سے وہ اقلیت ہی شمار ہوں، اگر وہ اس ملک کی اکثریت اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا دستور بنا لیتے ہیں جس کے تحت اکثریت اور اقلیت کی عدالت سے قطع نظر، یکساں حیثیت میں تمام مذاہب کے احترام اور کسی مذہب میں خواہ اکثریت میں ہو، خواہ اقلیت میں عدم مداخلت کا اصول طے کر لیتے ہیں، جس میں مذہبی عقائد، عبادات، مساجد، مدارس، اوقاف، تعلیم و تربیت کے نظام، تحریر و تقریر اور حصول معاش کے لیے پیشے کی آزادی اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع کی ضمانت موجود ہو۔ جس میں مذہبی، غیر مذہبی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، اصلاحی، تبلیغی جماعت بنانے، ملک میں آزادانہ گھومنے پھرنے، عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی سعی کرنے اور ملک کے کسی حصے میں بھی آباد ہو جانے، جائیداد بنانے، کاروبار کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہو، جس میں ذات پات کی اونچ نیچ اور نسل و خون کی کسی برتری کی نفی کی گئی ہو، وہ دستور غیر اسلامی کیوں کر ہو سکتا ہے؟ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ جس دستور کے تحت مذہبی تبلیغ کی آزادی نے مسلمانوں کے لیے اسلامی خدمات کا ایک وسیع میدان عمل مہیا کر کے اسلامی انقلاب کے وسیع امکانات پیدا کر دیے ہوں، جس دستور کی بنیاد مندرجہ ذیل انسانی اصولوں اور عالمی سچائیوں پر ہو، ہم اس کے خلاف اسلام ہونے کا فیصلہ کیوں کر دے سکتے ہیں:

کانگریس نے ہندوستان کے ہر شہری مرد اور عورت کے لیے مساوی

حقوق اور مواقع کی حمایت کی ہے۔ اس نے تمام گروہوں اور مذہبی گروپوں

کے درمیان رواداری اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کر کے اتحاد قائم کرنے کی

کوشش کی ہے۔ اس نے بہ حیثیت مجموعی تمام عوام کے لیے مکمل مواقع کی حمایت کی ہے، تاکہ وہ اپنی خواہشات اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکیں۔ اس نے اس بات کی بھی حمایت کی ہے کہ ایک قوم کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر گروپ اور علاقے کو آزادی ملے تاکہ وہ اپنی زندگی اور اپنے کلچر کو ترقی دے سکے۔ اسی لیے یہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیے علاقوں یا صوبوں کی جہاں تک ممکن ہو لسانی اور کلچرل بنیادوں پر تشکیل نو ہو۔ اس نے ان لوگوں کی حمایت کی، جن پر سماجی ظلم ہوا، جن کے ساتھ ناانصافی ہوئی تاکہ مساوات میں حائل تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو۔

کانگریس نے ایک جمہوری ریاست قائم کی، جس میں تمام شہریوں کے لیے مساوی بنیادی حقوق اور آزادیوں کی دستور کے ذریعے ضمانت دی گئی ہے۔ یہ دستور دفاعی نوعیت کا ہے جس کے قائم کرنے والی وحدتوں کو خود اختیاری دی گئی ہے اور اس کے قانون ساز اداروں کا قیام بالغ رائے دی کے اصول پر ہوتا ہے، وفاق ہند اس کے اجزا کی خواہش کی مطابق ہے۔ وفاق اکائیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی خاطر ضروری ہے کہ وفاق سبجیکٹس کی فہرست کم سے کم ہو۔ مزید یہ کہ اکائیوں کی خواہش کے مطابق مشرک فہرست بھی بنائی جائے۔

دستور ملک کے عوام کو جو بنیادی حقوق دے گا، وہ یہ ہیں؛

۱۔ ہر شہری کو رائے کے اظہار، جماعت بنانے، پر امن طریقے سے بغیر اسلحہ کسی بھی مقصد کے لیے اجتماع کرنے کی، جو قانون کے خلاف نہ ہو، آزادی ہوگی۔

۲۔ ہر شہری کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور اختیار ہو گا کہ وہ کسی بھی مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سے امن عامہ اور اخلاقی اقدار متاثر نہ ہوں۔

۳۔ اقلیتوں کے کلچر، زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے گا۔

۴۔ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے اور مذہب، فرقے، یا جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ سرکاری ملازمتوں میں مذہب، فرقے یا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کا

انتیاز نہیں برتا جائے گا۔

۶- عام مقامات پر واقع تمام کنوؤں، تالابوں، سڑکوں، اسکولوں کو جن کی دیکھ بھال ریاستی یا لوکل فنڈ سے ہوتی ہو یا جنھیں کسی نے عام استعمال کے لیے وقف کرایا ہو، ہر شہری کو استعمال کرنے کا مساوی اختیار ہوگا۔

۷- ہر شہری کو اسلحہ رکھنے اور ساتھ لے جانے کا اختیار ہوگا، جو اس سلسلے میں بنائے گئے قوانین اور تحفظات کا پابند ہوگا۔

۸- کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا، نہ اس کی ملک اور جائیداد کو ہتھیایا جائے گا یا اسے ضبط کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ ایسا قانون کے تحت ہو۔

۹- تمام مذہب کے معاملے میں ریاست غیر جانبدار رہے گی۔

۱۰- رائے دہی کا حق دنیا کے عام معیار بلوغیت کے مطابق ہوگا۔

۱۱- ریاست مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

۱۲- ہر شہری اس کے لیے آزاد ہوگا کہ وہ ہندوستان بھر میں جہاں چاہے

آئے جائے یا سکونت اختیار کرے، کوئی بھی پیشہ اختیار کرے۔ وہ

قانونی چارہ جوئی یا تحفظ کے معاملے میں ہند کے تمام علاقوں میں

مساوی حیثیت رکھے گا۔

ریاست پست اقوام اور مظلوم افراد کی حفاظت اور ان کی

ترقی کے لیے ضروری تحفظات فراہم کرے گی، تاکہ وہ تیزی سے ترقی

کر سکیں اور قومی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ خصوصیت

سے ریاست قبائلی علاقوں کے عوام کی نسلی تقاضوں کی مناسبت سے

اور اچھوتوں کے طبقے کی تعلیم، سوشل اور معاشی ترقی کی کوشش

کرے گی۔"

(Selected Works of Maulana Abul Kalam

Azad, Edited by Dr. Ravindra Kumar,

Vol.2, New Dehli (India), 1991, PP.121-23)

یہ کانگریس پارٹی کا وہ منشور ہے جو اس نے ۱۹۴۵ء میں انتخابات کے موقع پر شائع کیا تھا۔ حالاں کہ یہ وہ انتخابات تھے جنہیں ہندوستان میں کفر و اسلام کا معرکہ قرار دیا گیا تھا۔ کانگریس نے اس وقت بھی اپنے فکری نظریاتی نظام میں توازن برقرار رکھا تھا تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ کانگریس کے انتخابی منشور کے یہ اصول و مقاصد آزاد ہندوستان کے دستور میں اختیار کر لیے گئے ہیں۔

ہندوستان کا دستور انسانوں کا بنایا ہوا دستور ہے۔ اس کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ خامیوں اور نقائص سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس میں ترمیم و اصلاح کا دروازہ کھلا ہے تو اس کے خوب سے خوب تر بن جانے سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ اور ان کے مساعی نے اسلام کا نام لیے بغیر ہندوستانی دستور میں بہت سے ایسے اصول و مقاصد کو شامل کروا دیا ہے، جن کی روح اور فکری پس منظر اسلام کے نظام عدل اور انسانیت کے بنیادی حقوق و مفادات پر مبنی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان بصیرت اور حکمت سے کام لیں تو دستور ہند کی خامیاں اور نقائص دور کروا کے معاشرتی صلاح و فلاح کی بے شمار باتیں جن کا تعلق اسلامی تعلیمات سے ہے، اس میں شامل کروا سکتے ہیں۔

پاکستان میں دستور سازی کی داستان بڑی الم ناک ہے۔ ۱۹۵۸ء تک ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی بنیاد پر آرڈی نینسوں کے ذریعے حکومت چلائی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں پہلا جمہوری دستور بن گیا تھا اور اس کے تحت ۱۹۵۸ء میں پہلے انتخابات ہونے والے تھے کہ ایوب خان نے ملک پر مارشل لا مسلط کر دیا اور دستور منسوخ کر دیا۔ ایوب خان نے نہ صرف دستور منسوخ کیا بلکہ ملک کو بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کے ایک نئے نظام حکومت سے متعارف کرایا۔ ملک کی آئندہ تاریخ کے ابرس اس تجربے کی نذر کر دیے۔ ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان نے سنبھالی تو انھوں نے بیسک ڈیموکریسی کے نظام کی بساط کو تہ کر دیا اور حکومت چلانے کے لیے ایک عارضی لائحہ

عمل (Frame Work of Order) نافذ کیا۔ ۱۹۷۰ء میں الیکشن ہوئے لیکن اکثریت سے جیتنے والی پارٹی کو اقتدار منتقل نہیں کیا گیا اور اس کے نتیجے میں پاکستان کا ایک بازو اس سے الگ ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۹۷۳ء میں ملک کو ایک نیا متفقہ جمہوری اسلامی آئین ملا، لیکن ۱۹۷۷ء کے آئین کے تحت پہلے انتخابات کے فوراً بعد ملک ایک شدید آئینی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا اور اقتدار پر خود قابض ہو گئے۔ انھوں نے دستور کو منسوخ نہیں کیا، لیکن ترمیمات کر کے اس کی ایسی شکل بگاڑ دی کہ وہ کسی آزاد جمہوری ملک کا دستور معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ قوت و اختیار ایک شخصیت میں مرتکز ہو کر رہ گیا۔ اب ملک ایک بار پھر تجربات اور آئینی بحران کی زد میں تھا، شورائی نظام کا تجربہ، مجلس شوریٰ کا قیام، غیر جماعتی انتخابات اور حکومت کا قیام اور اس کی برخواسی، اسلامی نظام کیا ہے، وہ صدارتی ہے، آمرانہ ہے یا اس سے قریب پارلیمانی ہے یا غیر پارلیمانی یا اس سے دور اسلام کے نام پر ریفرنڈم کے ذریعے ایک شخصیت پر اعتماد اور تمام اختیارات کا ایک ہی آمرانہ شخصیت میں ارتکاز، حدود و تعزیرات آرڈی نینسوں کا اجرا۔ اس دور کی پروردہ بعض اسلامی جماعتوں کی دھما چوکڑی نے وہ حالات پیدا کیے کہ عوام کا اسلام پر ایمان متزلزل اور اسلامی نظام پر ان کا اعتقاد مجروح ہو گیا۔ ۱۹۸۸ء میں ایک آمرانہ شخصیت کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی اس کے گیارہ سالہ دور کی تربیت یافتہ نوکر شاہی اور مراعات یافتہ طبقے نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں ابھرنے والی نئی سیاسی جمہوری قوت کو پھینک دیا اور ۱۹۹۱ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس دوران میں سیاست میں کئی نشیب و فراز آئے، کئی حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں۔ یہ سب کچھ ۱۹۸۸ء تک کے حالات کے تسلسل ہی میں تھا۔

ان حالات کے لیے طالع آزمائروں، مفادپرست سیاست دانوں اور برٹش عہد کے بیوروکریٹوں اور ان کی تربیت یافتہ نوکر شاہی کو خواہ کتنا ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے اور خواہ دستور سازی کی تاریخ کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو اور خواہ انہوں نے اس میں اسلامی نظام نافذ نہ کیا ہو۔ اس بارے میں دوراے نہیں ہو سکتیں کہ یہ ملک مسلمانوں کا ہے اس میں قوت و اقتدار کے مالک مسلمان ہیں، انہیں قانون سازی کا کلی اختیار حاصل ہے۔ اگر وہ عوام کے مطالبے کے مطابق قانون سازی نہ کریں تو عوام ان سے باز پرس کر سکتے ہیں، لیکن ملک کی اسلامی و قانونی حیثیت ان کی بے عملی سے متاثر نہیں ہو سکتی مسلمان خواہ بے عمل اور خواہ حکمراں فسق و فجور میں مبتلا ہوں، لیکن وہ پاکستان میں اقتدار و اختیار کے مالک ہیں۔ ملک کی دستوری اور قانونی حیثیت اسلامی یا دارالاسلام کی مسلمہ ہے۔ پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کے نشیب و فراز اور اس کی الم ناکی سے اس کی بنیادی قانونی اور شرعی حیثیت متاثر نہیں ہوئی۔ اس لیے پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے حفظ و دفاع کے تمام اعمال مسلمانوں کے اسلامی فرائض میں شامل ہوں گے۔ یہ بات کہ ملک کی یہ حیثیت قرار داد مقاصد کے بعد ہوئی، پہلے نہ تھی۔ اس لیے پہلے کسی مسلمان پر ملک سے وفاداری اور حکومت کے فیصلوں کی پابندی لازم نہ تھی، نہایت غیر معقول ہے۔

اب ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ آزاد ملک ہیں، دونوں کے دستور الگ ہیں، اس لیے دونوں ملکوں کے مسلمانوں کی وفاداری کا مرکز ایک نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی مسلمان اپنے ملکی اور قومی فیصلوں کے پابند اور اپنے ملکی دستور کے وفادار ہوں گے اور اہل پاکستان اپنی حکومت کے فیصلوں کے پابند اور اپنے ملک اور دستور کے وفادار رہیں گے۔ اس کے باوجود کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا مذہب ایک ہے، دونوں الگ الگ دو قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کے ملکی، قومی اور سیاسی مقاصد و مفادات میں اختلاف و تباہی ہے۔ صرف اشتراک مذہب کی بنیاد پر

ایک دوسرے سے ہمنوائی اور وفاداری کی توقع کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ بانی پاکستانی کے اس اصول کا بھی کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں کہ ہندوستان کے صوبوں کی مسلمان اقلیت کے مفاد کو مسلمان اکثریت کے صوبوں (پاکستان) کے مفاد پر قربان کر دیا جانا چاہیے۔ اگر اس اصول کی کوئی اخلاقی اور قانونی حیثیت ہو اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہوں تو ہندوستان کے (۱۶ تا ۲۰ کروڑ) مسلمان پاکستان کے ۱۰،۹ کروڑ مسلمانوں سے بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ان سے پوچھا جائے کہ ان کا اجتماعی مفاد کیا ہے اور اس کے احترام میں پاکستان کے مسلمان اپنے مفادات و مقاصد سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن اس بات کا کوئی ہوش مند شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تقسیم ملک کے فیصلے (۳۔ جون ۱۹۴۷ء) کے بعد جب بانی پاکستان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کے وفادار رہیں (گفتار قائد اعظم۔ پروفیسر احمد سعید، ص ۱۵-۳۱۳) تو گویا انھوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی حکومت کی رعیت ہیں اور ان کا ہر معاملہ ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ یہی حیثیت پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کی تھی۔ گویا یہ بات قیام پاکستان کے وقت ہی قطعی طے شدہ تھی کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہندوستان کا داخلی مسئلہ ہے اور اگر کچھ ناخوش گوار حالات پیدا ہوئے تو انھیں ہندوستانی حکومت ہی حل کرے گی۔ اسی طرح پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو پاکستان خود حل کرے گا۔ کوئی ملک دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ لیاقت نہرو معاہدے نے اس کی توثیق مزید کر دی تھی۔

ہندوستان کی شرعی حیثیت

”ہندوستان اور دارالہرب“ کے نام سے دارالاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) کی طرف سے اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ بڑے سائز پر سات صفحے کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے جو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں ہندوستان کے متعلق دارالہرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اصل تحریر فارسی میں ہے۔ اس پر اردو میں مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی جو تقریب لکھی ہے اُس میں انھوں نے اس کی روئداد لکھی ہے کہ یہ تحریر خانقاہ رحمانیہ تک کیوں کر پہنچی، اور پھر جزم و یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس تحریر کے مصنف (صرف کاتب یا ناقل نہیں) حضرت شاہ صاحب ہی ہیں، اور اس بنا پر یہ فتویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے، امیر شریعت بہار نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہاتوں موجودہ ہندوستان کی نسبت بھی اپنے عندیہ کا اظہار کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

”ظاہر ہے حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے، جب کہ انگریزوں کا دور حکومت تھا، اس تحریر میں دارالہرب کے لیے جو اصل و بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“

اس بنا پر اس موضوع پر ہماری گفتگو کے دو جزو ہوں گے۔ پہلے جز میں گفتگو زیر بحث تحریر و رسالہ سے متعلق ہوگی، اور دوسرے جز میں موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق۔

یہ رسالہ بہت ن ہونے شائع ہوا تھا اور انھیں نوں میں برہان میں تبصرہ کے لیے موصول ہوا تھا۔ لیکن میرے قیام کناڈا اور دوسرے سفر اور مصروفیتوں کے باعث کتب برائے تبصرہ کا جو عظیم انبار لگ گیا ہے یہ رسالہ بھی اسی انبار میں دبا پڑا رہا اور ابھی چند روز ہوئے تبصرہ کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے نظر سے گزرا ہے۔

شاہ صاحب کی طرف غلط انتساب :

ہم خود حضرت الاستاذ کے خط سے آشنا ہیں۔ اور آپ کے متعدد خطوط اور تحریریں ہمارے پاس محفوظ بھی تھیں جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں گھر کے سب سامان کے ساتھ لٹ گئیں۔ اس بناء پر اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحب تحریر نہیں۔ اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ چنانچہ اتنی بات تو مولانا منت اللہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ تحریر شاہ صاحب کے مسودات میں ملی ہے، اور اس پر شاہ صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔

کیا یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کا ہے :

اصل یہ ہے کہ اب سے کم و بیش پینتالیس برس پہلے یعنی ۱۹۲۵ء میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچی نے مکتبہ دارالتبلیغ دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف سے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عربی نام ”فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب ودار الاسلام“ اور اردو نام ”کیا ہندوستان دار الحرب ہے“ تھا، مفتی صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں :

”ہندوستان کے دارالاسلام ودارالحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطب عالم جنید زمان ابوحنیفہ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت مددح کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب نے احقر کو عطا فرمائی تھی۔ اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔“

علاوہ ازیں ہمارے شعبہ دنییات کے لکچرار قاری محمد رضوان الشرجن کو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب ان کو ایک خط مورخہ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ میں تحریر فرماتے ہیں:

”میں قدیم زمانہ طالب علمی سے سنتا تھا کہ حضرت گنگوہی کا کوئی فتویٰ اس سلسلہ میں مفصل ہے۔ پھر عرصہ دراز کے بعد میں گنگوہ گیا تو حضرت گنگوہی کے مسودات میں مجھے یہ فتویٰ ملا اور میں نے اسے حکیم مسعود احمد صاحب سے مانگ لیا جو آپ نے عنایت فرما دیا۔ میں نے اردو ترجمہ کے ساتھ اس کو شائع کر دیا“

جناب مفتی صاحب نے اس فتویٰ کو اس طرح شائع کیا ہے کہ اوپر اصل متن فارسی میں ہے، اس کے نیچے خود مفتی صاحب کے قلم سے اردو ترجمہ ہے اور ادھر ادھر جو حواشی ہیں وہ مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے لکھے ہیں جو اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے۔ اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر مؤخر الذکر کی حرف بحرف نقل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فتویٰ کے ناقل چوں کہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لیے اٹلا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک و صاف ہے اور مفتی صاحب کے شائع کردہ رسالہ میں متعدد غلطیاں تصحیح سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت شاہ صاحب نے اس کو نقل کرتے وقت اصل عبارت میں جو بعض جملے مکرر یا غیر ضروری تھے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس معمولی فرق کے علاوہ دونوں تحریریں من و عن ایک ہیں، اس بنا پر جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا بھی ہے جہاں حضرت گنگوہی کے متعدد واقعات و تلامذہ کے پاس حضرت کے اس فتویٰ کی نقول موجود تھیں ایک نقل حضرت شاہ صاحب کے پاس بھی تھی۔ اور اس کو ہی خود حضرت شاہ صاحب کی تحریر سمجھ کر آپ کی طرف منسوب کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی رائے:

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ زیر تبصرہ فتویٰ حضرت شاہ صاحب کا سرگنہ نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خود حضرت شاہ صاحب کا اس بارہ میں خیال کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالامان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ فقہا کی اصطلاح میں (جس پر بحث آگے آرہی ہے) دارالعہد تھا۔

چنانچہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں پشاور کی جمعیتہ علمائے ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحیثیت صدر کے آپ نے جو ایک نہایت معرکہ آرا خطبہ صدارت فارسی زبان میں پڑھا تھا اُس میں اس کا ذکر کیا ہے، اور ہندوستان کی اُس وقت کی پوزیشن کا مقابلہ اُس وقت سے کیا ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودِ مدینہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

”ملک ما اگرہست دارِ امان ست و ما سکونت اندان داریم۔ باید کہ احکام این دار از کتب مذہب تلاش کنیم۔ استیعاب آن این وقت ممکن نیست البتہ جملہ چند از معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ در ابتدا ہجرت از سیرت ابن ہشام نقل می کنم کہ نمونہ از نوعیت معاہدہ با غیر مسلم در غیر دارِ اسلام معلوم شود۔“

شاہ صاحب ہندوستان کو دارالعہد مانتے تھے، اسی وجہ سے پشاور کے مذکورہ بالا اجلاس میں حکومت ہند سے محکمہ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا، اور اس سلسلہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی اُس میں محکمہ سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے۔ ”جو بحسب معاہدہ حکومت ہمارا شرعی حق ہے یہ حضرت گنگوہی کا ایک اور مطبوعہ فتویٰ:

اب آئیے اصل تحریر پر گفتگو کریں۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے جرم و یقین کے ساتھ بیان کیا اور لکھا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تو قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر پر حضرت گنگوہی کے دستخط نہیں ہیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں مفتی صاحب کو اسی طرح ملی تھی جس طرح مولانا منت اللہ کو شاہ صاحب کے مسودات میں دستیاب ہوئی تھی۔ ایک بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت

گنگوہی نے پوری قوت و صراحت کے ساتھ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔ لیکن ایک اور فتویٰ جو مطبوعہ ہے اور جس پر آپ کے دستخط اور مہر بھی ہے وہ فتویٰ اول کی تردید کرتا ہے چنانچہ ایک شخص نے سوال کیا ”ہندو دارالحرب ہے یا نہیں؟“ اس کے جواب میں فرمایا:

”ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بظاہر تحقیق حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی۔ حسب تحقیق اپنی کے سب نے فرمایا ہے، اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔“

فقط واللہ تعالیٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ گنگوہی

غور کیجیے کہانی وہ جزم و یقین اور کہاں یہ تردد و تذبذب۔ اس مؤخر الذکر فتویٰ پر جو تاریخ کدہ ہے وہ ۱۲۰۱ ہجری ہے۔ پہلے فتویٰ پر نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی تو فتویٰ ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۱ ہجری سے برسوں پہلے تو حضرت کو ہند کی کیفیت کا بخوبی اور واضح طور پر علم تھا اور اس بنا پر آپ نے ملک کو دارالحرب قرار دے دیا۔ لیکن اس واقعہ کے برسوں بعد آپ کو ہند کی کیفیت کی خوب تحقیق نہیں رہی اور اس لیے اب ہند کو نہ دارالاسلام فرماتے ہیں اور نہ دارالحرب۔ کیا کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس ترتیب کو باور کر سکتا ہے!!

ایک تضاد:

اس کے علاوہ ایک اور اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے شائع کردہ رسالہ کے خاتمہ پر مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے حواشی کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھی ہے جس میں وہ حضرت گنگوہی کے حوالہ سے ہندوستان کو دارالامان کہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”یہاں یہ بات ظاہر کر دینا بہت ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثناء اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دارالحرب ہے۔ مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے۔۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہجرت

ضروری نہیں ہے۔ کاتب الحروف کے استفسار پر حضرت گنگوہی نے ایسا ہی مشافہت فرمایا تھا جو بندہ کو خوب اچھی طرح سے یاد ہے۔

ان تینوں تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا گنگوہی نے ہندوستان کی نسبت فرمایا:

(الف) ہندو دارالحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں۔

(ج) ہند دارالامان ہے۔

اب ”کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟“

تاریخی پس منظر:

حقیقت یہ ہے کہ آپ اس معنی کو اُس وقت تک حل کر ہی نہیں سکتے جب تک ان آرا اور افکار و خیالات کو گذشتہ دو ڈھائی سو برس کی تاریخ کے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہوا تو کسی منزل پر پہنچ کر رکا نہیں، بلکہ روز بروز حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہی جو عالمگیر کی وفات سے پانچ برس یعنی ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے پوری سوسائٹی ”تن ہمہ داغ داغ شد پینہ کجا کجا نہم“ کا مصداق بن گئی تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان، اعیان و امراء، علماء، صوفیہ، تجار، عوام اور خواص غرضکہ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کا ماتم شاہ صاحب نے تفہیمات میں خصوصاً اور دوسری کتابوں میں عموماً بڑے درد و کرب کے ساتھ نہ کیا ہو، اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بد امنی اور شورش عام کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

”دہلی والوں کے لیے زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے

ذریعہ ان مصائب و آلام ناگفتنی سے دستکاری کی سوچنے لگے تھے“ ۲۷

اس وقت خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی کا کیا عالم تھا اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ کے اس شعر سے ہوگا!

كَانَ نَجْوًا وَمُضْتًا فِي الْغِيَا هَبْ عِيُونَ الْإِفَاعِي أَوْ رُؤْسَ الْعُقَارِبِ

ترجمہ :- جو ستارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوڑوں کے ڈنک۔ ہندوستان جو فقہاء کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دارالاسلام بنا چلا آ رہا تھا۔ ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب بھی دارالاسلام ہے یا نہیں؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گزرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے، اور اس بنا پر یہ بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نیم شعور فی ہن میں ہندوستان کی نسبت دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے نہایت اثر انگیز اور پُر جوش خطوط کے ذریعہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو فوجی طاقت کے ذریعہ اصلاح حال کی دعوت دی اور آخر کار جب اس سے کام نہیں چلا تو احمد شاہ ابدالی کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جس میں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو مرہٹہ راج گدڑی سے نجات دلائے۔

ابدالی طوفان برق و باد کی طرح آیا مگر!

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

میدانِ پانی پت میں اُس نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور جو کچھ ہاتھ لگا سے لے لیا واپس چلا گیا۔ اس زبردست بھونچال سے عہرت پذیر ہو کر سنبھلنے کے بجائے مرہٹہ سلطنت کا حال اور ابتر ہو گیا، مرہٹوں کا اب وہ زور تو رہا ہی نہیں تھا، اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی ابھرنی شروع ہوئی۔ یہ نہایت منظم، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی، اُس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم کر لیا کہ ۱۸۱۷ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو گئیں اور

لے شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات : مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۵ تا ۵۳۔

اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔
شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ :

یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بنا پر شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف نکتوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ بعض کتب فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاریٰ کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے۔۔۔۔۔۔ ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤں کشتی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑھے نہ کریں مگر ان احکام کی اصل الاصول ان کے نزدیک بالکل بیخ اور ضائع ہیں۔ کیوں کہ مسجدوں کو جو خانہ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لیے بغیر دلی یا اُس کے گرد و نواح میں داخل ہونا چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آ سکتے۔۔۔۔۔۔ غرض کہ جب حدیثوں اور صحابہ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر تجسس نگا ہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں ہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب کا حکم رکھتا ہے۔“

علاوہ ازیں ایک شخص نے دارالحرب میں سودی لین دین کے بارہ میں سوال کیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں بھی دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال و آراء نقل کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مبتائی پریس ص ۱۷۱-۱۷۲۔ یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ فتویٰ میں شاہ صاحب نے دہلی سے کلکتہ تک انگریزوں کا عمل دخل بتایا اور اس لیے اس علاقہ کو دارالحرب کہا ہے، لیکن ملفوظات میں فرماتے ہیں ”کلکتہ سے

لاہور تک کا علاقہ دارالحرب ہے“ ص ۱۲۳۔ اردو ترجمہ شائع کردہ پاکستان ایجوکیشن پبلشرز۔ کراچی

”اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دارالہرب
ہیں“

دیگر علما کے فتاویٰ :

شاہ عبدالعزیز صاحب اس فتوے میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے علما کا فتویٰ بھی یہی تھا۔
چنانچہ ڈاکٹر منظر لکھتا ہے :-

”ہوں جنوں ہماری (انگریزوں کی) طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتوؤں میں ہندوستان

کا دارالہرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحمی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز
کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ”عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ

سے لے کر دہلی اور ہندوستانِ خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی

صوبے تک) سب دارالہرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا

ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات

پیدا ہو جائیں وہ دارالہرب ہے۔“

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک :

ہندوستان کے انگریزی مقبوضات جن میں دلی بھی شامل تھی۔ اُن کے متعلق علمائے اعلام

کی طرف سے دارالہرب ہونے کا اعلان ہو جانے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے صرف دو راہیں

ہی ہو سکتی تھی، ایک یہ کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو جہاد کریں اور دوسرے یہ کہ اگر جہاد نہیں کر

سکتے تو ہجرت کر جائیں۔ دوسری شکل اختیار کرنا حد درجہ کی بزدلی اور نامردی کی بات ہوتی

اس لیے پہلی صورت اختیار کی گئی۔ چنانچہ مدرسہ شاہ ولی اللہی کے تربیت یافتہ خصوصی سید

احمد شہید بریلوی ۱۶ مئی ۱۸۲۶ء کو اپنے پانسوچھ سو معتقدین و مریدین کے ساتھ وطن

مالوٹ سے روانہ ہوئے۔ جہینوں کے سخت دشوار اور کٹھن سفر کے بعد ایک جمعیت کثیر

ہیسا کی اور سرحد پہنچ کر ۱۸۲۷ء کے ابتدا میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اگرچہ پنجاب کی

سکھ حکومت کے خلاف تھا جہاں اسلامی شغائر کے علاوہ اظہار و بجا آوری تک پر پابندیاں تھیں

۱۷ فتاویٰ عزیزی ص ۱۸۵ ۱۷ بحوالہ نقش حیات جلد دوم از مولانا سید حسین احمد مدنی حاشیہ ص ۴۔

لیکن سید صاحب نے کل ہند پیمانہ پر جو تیاریاں کی تھیں وہ صاف طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور اسے صحیح معنی میں دارالاسلام بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندوراؤ کو جو مکتوب گراہی لکھا ہے اُس میں فرماتے ہیں :-

”جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آکر بادشاہ زمین و زمان ہو گئے ہیں اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہنچ گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کر دی ہیں اور ان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان حالات کے باوجود) چونکہ ارباب ریاست و سیاست گوشہ گنہگار و بے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لیے ہم چند فقیر و اہل مسکنت محض دین رب العالین کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں“

علاوہ انہی مذکورہ بالا ریاست کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خان کو جو خط لکھا ہے اُس میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں :-

”آپ سردار والا مراتب راجہ ہندوراؤ کو یہ امر ذہن نشین کرادیں کہ ہندوستان کے اکثر شہر غیر ملکی لوگوں (انگریز) کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور یہ ہر جگہ ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کو انہوں نے برباد کر دیا ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں چونکہ بڑے بڑے ارباب ریاست ان کے ساتھ نبرد آزمائی سے عاجز ہیں اس لیے ہم چند ضعیف و کمزور انسان کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔“

قدرت اپنی حکمتیں خود ہی جانتی ہے۔ یہ جہاد ناکام رہا، اور سید صاحب گھر سے ایسے رخصت ہوئے تھے کہ پھر واپس نہ آئے۔ ایک رہبر و راہ طلب و جستجو کی غیرت و خودداری کی انتہا ہے!

۱۔ مجموعہ خطوط قلمی بحوالہ ”مسلمانوں کے تنزل سے نیا کو کیا نقصان پہنچا“ از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۶۲-۲۶۶

۲۔ دونوں خطوں کے لیے دیکھیے ”مکاتیب سید احمد شہید“ (عکسی) مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ورق ۷۹، ۸۰۔

ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

(غالب)

یہ صاحب اپنے ہزاروں فداکاروں کے ساتھ جام شہادت نوش کر کے واصل بحق ہو گئے لیکن جو آگ ہزاروں دلوں میں روشن کر چکے تھے وہ دشمن کے آپ شمشیر سے کہاں بچھ سکتی تھی ان کے بعد تحریک مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ صادق پور سے درہ تینبر تک قائم ہو گیا۔ اور اب ان کا براہ راست مقصد انگریزوں کو ملک باہر کر کے اُس کی قدیم حیثیت کو بحال کرنا تھا، ادھر یہ مجاہدین اپنی جدوجہد میں مصروف تھے اور ادھر دلی آؤ لکھنؤ میں تیزی سے وہ حالات پیدا ہو رہے تھے جن کے بطن سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ظہور ہوا۔

جہاد کا براہ راست فتویٰ :

آخر انگریزوں کی روز افزوں زیادتیوں اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی بے چارگی و بے بسی کے باعث جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو دلی کے اخبار انظر میں کھلم کھلا یہ استفتاء چھپا :

”کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟“

اس استفتاء کا جواب مرتب کرنے کے لیے جامع مسجد دلی میں علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع ہوا۔ اور فتویٰ ذیل مرتب کر کے شائع کیا گیا :

”الجواب :- در صورت مرقومہ فرض عین ہے، اور تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور موجود ہونے آلات حرب کے، تو فرض عین ہونے میں کیا

مولانا فضل حق کا فتویٰ :

اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل موجود ہے اس پر ۳۸ دلی کے علماء و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں، لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ ریسانہ طور پر طریقی زندگی رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلی کی جامع میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے ذریعے، ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی، اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خان آزرہ، مولانا فیض احمد بدایونی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبر آبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں آگ لگ گئی اور خاص دہلی میں نوٹے ہزار سپاہ جمع ہو گئی، ادھر یہ ہوا اور دوسری طرف اکبر دیوبند جو سلسلہ دلی الہی کے بقیۃ السلف تھے یعنی حضرت حاجی امداد اللہ۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی وغیرہم انھوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دیا اور جنگ چھڑی تو اس میں عملاً حصہ لے کر داد شجاعت دی۔

مسلمانوں کے لیے یہ جہاد تھا۔ لیکن استخلاص وطن کی غرض سے غیر مسلم بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک تھے، اور اس بناء پر اس کا اہتمام و انتظام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا لیکن باایں ہمہ یہ کوشش بھی ناکام رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کے مقبوضات و مستعمرات میں شامل ہو گیا۔ اس جنگ میں ناکامی کے باوجود مجاہدین نے ہار نہیں مانی اور ان کی سرگرمیاں ایک خاص دائرہ عمل میں برابر جاری رہیں اور ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں انگریزوں اور مجاہدین میں سخت معرکہ ہوا۔

اگرچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ اب کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا ہر شخص کو مذہبی آزادی ہوگی اور حصولِ معاش کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوں گے لیکن شروع شروع میں اس اعلان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا، اور مجاہدین کی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں جتنا استحکام پیدا ہوتا رہا۔ ملک میں امن و امان اور انفرادی و جماعتی آزادی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ اب مذہب آزاد تھا۔ دینی تعلیم و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی، قانون مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت کرتا تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ حصولِ معاش کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو سرکاری دفتروں اور محکموں میں جگہیں مل رہی تھیں۔ غرض کہ اب انگریزوں کے ساتھ جنگ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ بدیشی تھی اور یہ صورتِ پہلی صورتِ حال سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے جنگ تھی۔ اب صلح تھی۔ پہلے حرب و ضرب کا دور تھا اب امن و امان کا عہد تھا، اور اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ وہ تعلیمی اقتصادی اور مذہبی بنیادوں پر تنظیم کر کے اپنے لیے نشاۃ ثانیہ کا سروسامان کریں۔

مولانا گنگوہی کے مختلف اقوال کے وجوہ :

سطورِ بالا میں ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے لے کر انیسویں صدی کے رُبعِ آخر تک کے حالات کا جو نہایت ہی مختصر اور سرسری جائزہ لیا ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے رہے ہیں اور جو جو تغیر ہوتا رہا ہے بحیثیتِ مجموعی علماء کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطہ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ اس بنا پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے۔ چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کا پہلا فتویٰ بزبانِ فارسی و شائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کا ہے یا اُس کے فوراً بعد کا جب کہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی اور ادھ مجاہدین بھی مرگے مچھلے تھے۔

مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا۔ لیکن ساتھ ہی کھل کر دارالحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکے۔ اور جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے امن و امان مکمل طور پر بحال ہو گیا اور مذہبی فرائض و معمولات بلا خوف و خطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دارالامان قرار دیا۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد:

مولانا گنگوہی نے تو ترقی کر کے ہندوستان کو دارالامان ہی کہا ہے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے ”ہندوستان میں سودی لین دین“ پر بہ صورتِ مکتوب جو ایک نہایت پر مغز اور بسوط رسالہ لکھا ہے اس میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باقی روایات منقولہ ہندستان دارالاسلام ہست ان روایات کے پیش نظر ہندوستان دارالاسلام ہے اگرچہ اس معاملہ میں مولانا کو پورا اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ آخر رسالہ میں فرماتے ہیں:

دارالحرب ہندستان کلام چنانچہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کلام ہے
از مطالعہ روایات منقولہ دریافتی باشی
اگرچہ راجح نزدیحمدان ہمیں باشد کہ
ہندوستان دارالحرب است۔

جیسا کہ گذشتہ روایات منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا
اگرچہ اس مہجدان کے نزدیک راجح ہی ہے
کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔

لیکن چونکہ رسالہ کا اصل موضوع بحث دارالحرب میں ”سودی لین دین“ ہے اس بنا پر مولانا نے اس پر بڑی سیر حاصل بحث کے ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ ”اول تو ہندوستان دارالحرب نہیں دارالاسلام ہے۔ لیکن اگر دارالحرب ہے بھی تو مسلمان کے لیے حسب روایات فقہیہ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ دارالحرب میں قیام کر کے سود کھاتا رہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ سود دارالحرب میں لے اور اسے برتے دارالاسلام میں، جو لوگ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اس میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا نانوتوی ان پر ایک نہایت لطیف قسم کا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۵ قاسم العلوم جلد اول مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبیائی۔

”یہ بڑے عجیب و غریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا! اگر ہندوستان دارالحرب ہے تو تمہیں ہجرت کرنی چاہیے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دارالاسلام ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھٹ بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو دارالحرب ہے، گویا پت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لیے اس ملک کو دارالاسلام کہہ دیا اور سود کھانے کے لیے اسے دارالحرب قرار دے دیا۔ سبحان اللہ!

مولانا عبدالحی لکھنوی کا فتویٰ :

مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی ان علما میں سے تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ میدان جنگ میں اُس سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی خصوصاً اور عام اہل ملک کی عموماً عظیم تباہی و بربادی، خستہ حالی و پامالی بچشم خود دیکھی تھی۔ اس بنا پر حالات خواہ کیسے ہی پُر امن ہوں بہر حال انگریزوں کے خلاف دلوں میں جو کدورت اور عہد گزشتہ کی جو تلخ یاد تھی اُس کی وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کوئی بات کہتے بھی ہیں تو رک رک کر اور کسی درجہ میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ لیکن مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی جن کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے اُن کے لیے اس قسم کا کوئی حجاب ذہنی نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بالکل صاف و صریح لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی نفی کی، اور اس کے دارالاسلام ہونے کا اثبات کیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ ”جہاں تک عمل داری انگریزوں کی ہے ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق بھی“ مولانا جواب میں فرماتے ہیں :

”ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔“

اس کے بعد مولانا نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کتب فقہیہ سے طویل عبارتیں

نقل کیں اور ان کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں :

”ان عبارات سے اور ان کے امثال سے واضح ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکام کفر علانیہ جاری ہوں، اور احکام اسلام بالکلیہ موقوف کر دیے جائیں، اور شعائر اسلام اور ضروریات دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط (متفق علیہ) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور سب دو شرطیں زائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکت اہل اسلام کا باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ امان اول اٹھ جائے اور با مان کفار اقامت کی نوبت آئی ہو اور ظاہر ہے کہ بلاد ہندوستان میں مفقود ہے۔

اس لیے کہ شعائر اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے۔ اگرچہ اکثر قضاة کفار ہیں اور خلاف اسلام احکام جاری کرتے ہیں، مگر بہت سے امور میں مذہب اسلام اور شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ہندوستان امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دارالحرب نہیں ہے۔“

ایک اور فتویٰ :

اسی نوع کا ایک اور فتویٰ کلکتہ میں نواب عبداللطیف صاحب نے جب انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ بعض علماء سے حاصل کر کے شائع کیا تھا۔ ان علماء میں تحریک مجاہدین کے ممتاز عالم مولانا کرامت علی صاحب بھی شامل تھے اور فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ ”انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب نہیں ہے۔“

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان ”لذت کشی درد تیر جام“ کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت مسلمانوں میں کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خفیہ یعنی انڈر گراؤنڈ۔ اور ان کی تمام تر توجہات دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر جیب و دامن تار تار پزنجیہ گری کے لیے وقف تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں اگرچہ وجود میں آچکی تھیں لیکن اول الذکر

۱۔ ترجمہ اردو مجموعۃ الفتاویٰ مولانا محمد عبدالحمید مطبوعہ قیومی پریس کانپور جلد اول ص ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

۲۔ ہندوستانی مسلمان (انگریزی) رام گوپال صاحب ص ۶۵۔

کا مقصد انگریزوں کے ماتحت چند داخلی اور انتظامی اصلاحات اور موخر الذکر کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا اس بنا پر ہندوستان پر جب دارالحرب کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو مولانا عبدالحی کو لامحالہ اسے دارالاسلام ہی کہنا تھا۔

تحریک ہجرت :

لیکن جن علما کے سینوں میں سید احمد شہید کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے ابھی تک خاکستر نہیں ہوئے تھے وہ کب نچلے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ایک فتویٰ کے ذریعہ ترک وطن کی تحریک شروع کر دی، مولانا غلام رسول مہر جو ہندوپاک کی جدید اسلامی تاریخ کے مبصر عالم ہیں بیان کرتے ہیں :

”تحریک خلافت کی تنظیم سے پیشتر علما کے فتویٰ سے یہاں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے، اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہنچتی کہ لاکھوں مسلمان ترک وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لیے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی۔“

دوسری تحریکیں :

انھیں دنوں میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت و شمولیت کا مسئلہ اٹھا اور مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن اور لدھیانہ و دیوبند کے بہت سے علمائے کانگریس میں شرکت کے جواز اور سرسید کی قائم کی ہوئی جماعت ”جماعتِ مجاہدین وطن“ نے شرکت کی ممانعت کا فتویٰ شائع کیا۔ پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں

۱۔ ہمیں ان حضرات اور مشائخ کا بھی علم ہے جنہوں نے سفید فام فرمانروایان ہند کو ناصر الملتہ والدین اور حامی شریعت مصطفوی کہا ہے اور ترکوں کے مقابلہ میں بیچے ہوئے ہندوستانی مسلمان فوجیوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے ہیں لیکن ان حضرات کو عوام میں کوئی سند اعتماد و اعتبار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ان کا

ذکر غیر ضروری ہے۔ ۱۔ ملاقاتیں : مرتبہ الطاف حسن صاحب قریشی ص ۱۸۶۔

۲۔ نقش حیات : از مولانا حسین احمد صاحب مدنی جلد دوم ص ۷۱۔

تحریک انقلاب یا بالفاظِ دیگر "ریشمی خطوط کی تحریک" شروع ہوئی۔ اس کے بعد خلافت اور پھر ترک موالات کی تحریکوں کا دور آیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس پورے دور میں جب کہ انگریزوں کے خلاف یہ تحریکیں چل رہی تھیں۔ ہندوستان کی نسبت ان علما کا جو تحریکوں سے وابستہ تھے شرعی طور پر کیا نقطہ نظر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی تھا۔ لیکن اگر یہ تمام کوششیں آئین اور قانون کے اندر کر کے کی گئی ہیں تو ظاہر ہے اس صورت میں ملک کی شرعی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے، اور اگر ان تحریکوں میں حرب و ضرب، تشدد اور قانون شکنی وغیرہ ان سب چیزوں کو تحریکوں کے بانی اور ہمدرد علما کی تائید و رضامندی کی سند حاصل تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی نظر میں ہندوستان کی حیثیت پہلی حیثیت سے مختلف تھی۔

دارالہند:

اس سلسلہ میں ہم صرف دو تحریکیں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک مولانا محمد انور شاہ الکنشیری کی اور دوسری مولانا سید حسین احمد مدنی کی! حضرت شاہ صاحب کے متعلق اجمالاً گزر چکا ہے کہ آپ نے پشاور کے خطبہ صدارت میں ہندوستان کو دارالامان کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ درحقیقت شاہ صاحب کی مراد دارالامان سے دارالہند ہے۔ چنانچہ خطبہ متعلقہ میں آپ نے حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات کی شرعی نوعیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس کی تائید کی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا بدیع عالم مرحوم حضرت شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانوں کو انگریزوں کے ہاتھوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے۔ لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اگرچہ حکومت اور اہل ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن عملاً معاہدہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور جانی و مالی امور میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور

اُن تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا ہے۔

مگر میرے نزدیک حکم یہی ہے اور اس پر ہی تمام تعریفات ہوں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاہدہ ہے تو پھر قومی تحریکوں میں توڑ پھوڑ مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں اُن کے جواز کی کیا صورت ہوگی؟ کیوں کہ یہ سب نقض عہد میں داخل ہیں، اور اسلام میں نقض عہد سخت گناہ ہے، غالباً ہی سوال حضرت شاہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ عبارت مذکورہ بالا کے فوراً بعد جواباً فرماتے ہیں:

”یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا۔ لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ

کو ہم نے اُن کے منہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور

ہم اُن کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارہ میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔ چنانچہ

انگریزوں کا مال چُرانا جائز نہیں ہے۔ البتہ ہاں اگر ہم اس معاہدہ کو بھی توڑ دیں

تو پھر مال کا چُرانا بھی جائز ہوگا۔ لیکن ایسا اسی وقت ہونا چاہیے جب کہ خود

حکومت اپنا عہد توڑ دے۔ تاکہ جواب ترکی بترکی ہو۔ غدار اور بے ایمانی نہ

ہو۔

مولانا حسین احمد مدنی کا فتویٰ:

لیکن مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بالکل اس کے برعکس ہندوستان کو دار الحرب اور

ہندو اور مسلمان دونوں کو اس ملک میں انگریزوں کے ہاتھوں قیدی قرار دیتے ہیں۔ اور

چونکہ مولانا کے نزدیک یہ ملک دار الحرب ہے اس لیے عورتوں کے سوا دشمنوں یعنی انگریزوں

کی ہر چیز مسلمانوں کے لیے متاح ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

”ہندوستان دار الحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دار الحرب باقی ہے گا جب تک اُس میں کفر

کو غلبہ حاصل رہے گا۔ دار الحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان

۱۔ فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۲۲۹۔ ۲۔ فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۲۲۹۔

۳۔ مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اول مطبوعہ معارف پریس اعظم ص ۱۸۔

کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا گلوی کے فتاویٰ کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں :

”ان پر (یعنی ان حضرات نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر) کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔“
اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ۱۸۵۳ء اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں اور ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں کسی قسم کا کوئی فرق ہی نہیں ہوا۔
حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایک سیاسی انقلاب پسند انسان تھے، انگریز دشمنی میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے۔ برطانیہ اور اس کی حکومت کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جب کبھی وہ بولتے ہیں تو قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی عام فلاح و ترقی سے قطع نظر خاص مسلمانوں نے ستر اسی برس کے اندر انگریزوں کے زیر سایہ ہر شعبہ زندگی میں جو ترقی کی ہے۔ اور وہ بھی امن و امان کے ساتھ! مسلمانوں نے خود اپنے عہد حکومت کے گذشتہ دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ چنانچہ راج گوپال اچار یہ کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بننے سے دو برس پہلے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے راج میں ننانوے فی صدی آزادی رکھتے اور اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بہر حال مولانا محمد انور شاہ اور مولانا حسین احمد دونوں ایک ہی مکتبہ فکر کے بزرگ اور ایک ہی استاد کے نامور شاگرد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق دونوں میں جو اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا مدنی پر سیاسی انقلاب پسندی اور انگریز دشمنی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اس معاملہ میں فقیہانہ بنیادگی و متانت اور تادمخ کا واقعاتی شعور مغلوب ہو جاتے تھے۔

۱۰ مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴

مولانا اشرف علی تھانوی :

اس کے برخلاف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو باعتبارِ فقہ اپنے تمام معاصرین میں امتیازِ خاص رکھتے تھے۔ ان کو دیکھیے آپ نے امداد الفتاویٰ میں متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے لیکن ہندوستان کو کہیں دارالحرب نہیں لکھا۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اُس نے سفر بخیر و خوبی طے کر لیا تو اب اُسے چاہیے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کر دے۔ تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔

بین تفاوتِ رہ از کجاست یا بجاست

مولانا محمد حسین بٹالوی :

ہم نے یہاں تک صرف اکابرِ علمائے احناف کے ارشادات و بیانات پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کے علماء بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارہ میں ان علمائے اعلام کی آراء اس لیے اور بھی لائقِ توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت پید احمد شہید کے زیرِ قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی بنا پر انگریز انہیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔ بہر حال اس جماعت کے علماء میں مولانا ابوسعید محمد حسین لاہوری (جو عام طور پر بٹالوی بھی مشہور ہیں) بلند پایہ عالم اور صاحبِ تصنیف و قلم بزرگ تھے۔ لاہور سے اشاعۃ السنۃ نامی ایک دینی پرچہ شائع ہوتا تھا۔ مولانا اُس کے اڈیٹر اور زمانہ کے اعتبار سے سرسید احمد خاں مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ہم عصر تھے۔ موصوف نے ۱۸۶۶ء میں ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے لکھا تھا جو انہیں دنوں میں وکٹوریہ پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے بڑی قوت اور زور سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ہرگز دارالحرب نہیں، اور اس بنا پر انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :

”جو مخالفین اسلام کسی کے مذہب سے تعرض کرنا جائز نہ سمجھیں اور اس امر کو خواہ
بمقتضائے مہانت خواہ بہ ہدایت مذہب خواہ بحکم عقل و اصول سلطنت بہت
بڑا سمجھیں۔ جیسا کہ برٹش گورنمنٹ کا حال و چال ہے۔ ان سے مذہبی جہاد کرنا
بہرگز جائز نہیں۔“

یہ تو ہوئی جہاد کی بات! اب ملک کی شرعی حیثیت کے بارہ میں سنئے۔ فرماتے ہیں:
”جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ
شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر
ہو۔ اقوام غیر نے اس پر تغلب سے تسلط پایا ہو (جیسا کہ ملک ہندوستان ہے)
تو جب تک اُس میں ادائے شعائر اسلام کی آزادی رہے وہ بحکم حالتِ قدیم
دارالاسلام کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ قدیم سے اقوام غیر کے قبضہ و تسلط میں ہو۔
مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعائر مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی
دارالاسلام اور کم سے کم دارالاسلم والا مان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق
ہے۔“

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین صاحب نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ اس
میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ رسالہ کے شروع میں (صفحہ ۳ و ۴) خود انھوں نے لکھا ہے
یہ رسالہ انھوں نے ۱۸۶۶ء میں لکھ لیا تھا۔ لیکن اُس کو شائع کرنے سے قبل انھوں
نے علمائے اسلام کی رائیں لینے کی غرض سے لاہور سے عظیم آباد پٹنہ تک کا سفر کیا اور
اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”اور اکابر علمائے مختلف فرہائے اسلام کو یہ رسالہ حرف بحرف سنا کر ان کا
توافق رائے حاصل کیا اور بعض بلاد ہندوستان و پنجاب میں جہاں راقم خود نہیں
جاسکا۔ اس رسالہ کی متعدد کاپیاں بھجوا کر ان بلاد کے اکابر علمائے اتفاق رائے
حاصل کیا۔“

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی :

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کس پایہ کے عالم تھے؟ اُن کی تصنیفات اور ترجمہ قرآن سے ظاہر ہے، اُن کے نزدیک بھی ہندوستان دارالہرب نہیں تھا بلکہ اگر کسی وقت انگریزوں نے مسلمانوں کے سفر حج پر کوئی پابندی مذہبی تعصب کے بغیر کسی عام مصلحت سے لگائی تھی تو وہ ہرگز مداخلت فی الدین نہیں تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

”دارالہرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کو فرائض اسلامی نماز روزہ، حج زکوٰۃ کے بجالانے سے روکے اور منع کرے۔ ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں.....
خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجود یکہ نصاریٰ کی عملداری ہے دارالہرب نہیں ہے اس لیے کہ یہاں بجا آوری فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں۔ اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفر حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی اور صلاح و مشورہ کے طور پر ہے۔ اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے جہاں اسلامی حکومت ہے۔ کہ مرض طاعون متعدی ہے ایک سے اڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ موسم حج میں لوگوں کا بہت سا اثر دام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے۔ پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لیے ہے کہ لوگ فریضہ حج نہ ادا کریں۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے ہے کہ حاجیوں کی جانیں ضائع نہ ہوں۔“



آزاد ہندوستان اور اس کا حکم

یہاں تک انگریزوں کے زمانہ کے ہندوستان کا تذکرہ تھا۔ اب ہمیں موجودہ آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت پر بحث کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری نے خود اس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ”حضرت شاہ صاحب (مولانا کشمیری) نے اپنی اس تحریر میں سب سے پہلے کسی ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کی اصل بنیاد بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

”باید دانست کہ مدار بودن بلدہ و ملکہ دارالاسلام یا دارالحرب بر غلبہ مسلمانان و کفارست و بس“

پھر اس اصول کو دلائل و شواہد اور حوالوں سے مستند و موثق فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”این اصل را خوب ذہن نشین باید کرد۔ کہ جملہ مسائل از ہمین اصل برمی آیند و ہمہ جزئیات این باب و اثر بر ہمین اصل بستند“

اس کے بعد اسی اصل پر تفریعات ہیں اور مختلف جزئیات و مسائل بیان فرمائے ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے اور آخر میں ہندوستان کی صورت حال بتلا کر اس ملک کے دارالحرب ہونے کا حکم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

”بہر حال تسلط کفار بر ہند بدان درجہ است کہ در پیش وقت کفار را بر دارالحرب زیادہ نمود۔ و ادائے مراسم اسلام از مسلمانان محض با جارت ایشان است و انہر مسلمانان عاجزترین رعایا کسے نیست“

یہ سب کچھ لکھنے لکھانے کے بعد مولانا منت اللہ صاحب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

”ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جب کہ انگریزوں کا دور حکومت تھا۔ اس تحریر میں دار الحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔“ (۱۴)

وہ فیصلہ کن رائے کیا ہے؟ مولانا نے اگرچہ اس کو گول مول رکھا ہے لیکن اس طرح کہ غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے (غالب) اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک موجودہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ پھر امیر شریعت بہار اس میں منفرد نہیں ہے بلکہ سابق ناظم جمعیتہ علمائے ہند مولانا محمد میاں کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک تحریر جو بصورتِ اقا ہے اس میں فرماتے ہیں:

”یہ ملک (جنوبی افریقہ) یقیناً دار الحرب ہے۔ کیونکہ مسلمان دوسرے اقتدار کے ماتحت ہیں، خود ان کی حکومت نہیں ہے۔ نہ ان کا کوئی ایسا با اختیار شرعی نظام یا کوئی ایسا نواب یا امیر شریعت ہے جس کو حکومت نے مسلمانوں کے معاملات کا اختیار دے رکھا ہو۔ ایسا ملک اصطلاح شریعت میں دار الحرب کہلاتا ہے۔“ اس کے بعد بعض کتبِ فقہ سے دو ایک عبارتیں نقل کی ہیں، اور پھر لکھتے ہیں:

”اگر آپ داس کا ترجمہ اسٹیٹ (ریاست) کر لیں تو دار الاسلام اور دار الحرب کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ غیر مسلم اسٹیٹ کو دار الحرب کہا جاتا ہے اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو، یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے تحت محفوظ رہیں۔“

اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو دار الاسلام نہیں ہے۔ بہر حال فقہ کی اصطلاح میں اس کو دار الحرب کہا جاتا ہے۔“ (روزنامہ الجمعیتہ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء ص ۴ کالم ۱)

مولانا محمد میاں کی یہ تحریر اگرچہ جنوبی افریقہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے، لیکن مذکورہ بالا عبارت میں آپ نے دار الحرب کی جو تعریف کی اور اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ ہندوستان کا حکم بھی آپ کے نزدیک وہی ہے

جو جنوبی افریقہ کا ہے۔ یعنی وہ بھی دارالحرب ہے اور ہندوستان بھی دارالحرب!

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:

جنوبی افریقہ کی ریاست کے بارہ میں ایک سوالنامہ دارالعلوم دیوبند میں بھی موصول ہوا تھا۔ یہاں کے دارالافتاء کی طرف سے اُس کا جو جواب گیا ہے اور جس پر مولوی محمد جمیل الرحمن نائب مفتی اور مفتی محمود احمد الصدیقی دونوں کے دستخط ہیں اور تاریخ یکم شعبان ۱۳۸۴ھ درج ہے۔ اُس میں بھی کم و بیش وہی بات کہی گئی ہے جو مولانا محمد میاں نے کہی ہے۔ اور اُس سے بھی استنباط ہی ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”آپ کی (یعنی سائل کی) تحریر کے مطابق جمہوریہ افریقیہ میں مسلمان اقل قلیل ہیں اور

یہ اس بات کی علامت ہے کہ جمہوریہ میں غلبہ و تسلط غیر مسلموں کا ہے اور یہی مدار ہے دارالحرب ہونے کا۔“

دارالحرب سے متعلق اوپر جو اقتباسات و بیانات نقل کیے گئے ہیں ان کو بیک نظر دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا مدار اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے استیلا و تسلط پر ہے۔ لیکن معاملہ فی نفسہ اس قدر آسان نہیں ہے کہ دو چار عجاہتیں فقہاء کی نقل کر کے اور اس پر دو تین جملے لکھ کر ختم کر دیا جائے۔ اس بنا پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث و گفتگو کریں گے، اور اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ اہل فقہاء کے نزدیک دارالحرب کی کیا تعریف ہے۔ اُس کی کیا پہچان اور کیا خصوصیات ہیں؟ (۲) دار کی قسمیں کتنی ہیں؟ اور ان اقسام میں یا ہم کیا نسبت ہے؟ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ قومیت اور وطنیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور دنیا کی تمام مسلم اور غیر مسلم حکومتیں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اسی جدید تصور پر دستاویز حکومت میں عمل پیرا ہو رہی ہیں۔ اسلامی تعلیمات و احکام کی رو سے ان ممالک کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو ہندوستان

کے دستور اور اس کے نظام حکومت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا کہ آزاد
ہندوستان مسلمانوں کے لیے شرعی طور پر کس قسم کا دار ہے اور مسلم ممالک کے لیے اس کی
شرعی حیثیت کیا ہے؟

دارالحرب کی تعریف اور اس کی خصوصیات:

کتاب فقہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہاء کے ذہن میں دارالحرب دو قسم
کے تھے۔ ایک وہ ملک جو شروع سے دارالحرب بنے چلے آ رہے ہیں، اور ان میں تغیر و تبدل
نہیں ہوا۔ اور دوسرے وہ ممالک جن کے حالات بدلتے بدلتے رہے ہیں، یعنی کبھی ان پر
مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور کبھی غیر مسلموں کا۔ اور جیسا کہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن
محمود الاشروسی نے لکھا ہے۔ دراصل یہ دوسرے قسم کے ہی ممالک ہیں جو اُس زمانہ میں
مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ جن کے باعث فقہاء
کو دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کر کے ان کی حد بندی کرنی پڑی۔

ہندوستان اگر دارالحرب ہے تو ظاہر ہے پہلی قسم کا تو ہرگز ہو ہی نہیں سکتا، لامحالہ دوسری
قسم کا ہی ہوگا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فقہاء کے نزدیک اس دارالحرب کی کیا تعریف اور اُس کی کیا
خصوصیات ہیں:

امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا اختلاف:

اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ امام ابو یوسف اور
امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی ملک پر مشرکین کا قبضہ ہو جائے اور وہ اُس میں احکام شرک
ظاہر کرنے لگیں تو وہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اس پر اکتفا نہیں فرماتے
بلکہ آپ کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب بن جانے کے لیے اُس میں تین شرائط کا پایا جانا

۱۔ کتاب الفصول ج ۲ درق ۲ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند مصنف جن کا انتقال ۶۳۲ھ میں ہوا ہے۔ ماوراء النہر

کے اکابر مجتہدین و فقہاء میں سے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جو بڑی پایہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا تذکرہ

کشف الظنون ص ۸۲ میں ہے۔ اور مولانا جلالی لکنوی نے الفوائد البہیہ مطبوعہ مطبع مصطفائی،

لکنؤ میں صفحہ ۸۲ و ۸۳ پر بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

ضروری ہے۔ امام صاحب اور صاحبین کی یہ رائے فقہ حنفی کی سب سے مشہور کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم صرف بسوط للشرعی سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں:

والحاصل ان عند ابی حنیفة
انما تصیر دارہم دار الحرب
بثلاث شرائط احدها ان تكون
متاخمة ارض لترك یس بینہا
وبین ارض الحرب داراً للمسلمین
الثانی ان لا یبقی فیہا مسلم
امن بامانہ ولا ذمی امن
بامانہ۔ الثالث ان ینظروا
احکام الشریک فیہا
وعن ابی یوسف ومحمد اذا
اظهروا احکام الشریک
فیہا فقد ضارت دارہم دار
حرب لہ

غرض کہ ابو حنیفہ کے نزدیک غیر مسلموں کا
ملک تین شرطوں سے دار الحرب بنتا ہے (۱)
ایک یہ کہ یہ ملک تاتاریوں (اُس وقت
تک یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے
ملک سے ملا ہوا ہو یعنی اس ملک اور ارض حرب
میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ
اس میں کوئی مسلمان سابق امان کے ساتھ نہ ہو
اور اسی طرح کوئی ذمی سابق امان کے ساتھ نہ
ہو (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کے
احکام ظاہر کریں، اس کے برخلاف ابو یوسف
اور محمد کے نزدیک احکام شرک کے ظاہر
کرتے ہی یہ ملک دار الحرب بن جاتا
ہے۔

اس عبارت اور اسی جیسی دوسری عبارتوں سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صحابین
کے نزدیک محض احکام شرک کے اظہار سے ملک دار الحرب بن جاتا ہے اور اس کے برخلاف
امام ابو حنیفہ کی رائے میں کوئی ملک اُس وقت تک دار الحرب نہیں ہو سکتا جب تک اُس
میں شرائط نہ گانہ ایک ساتھ نہ پائی جائیں اس بنا پر یہ اختلاف حقیقی ہے اور چونکہ امام صاحب
کے شرائط نہ گانہ میں خود صحابین کی شرط داخل ہے اس لیے ان دونوں مسلکوں میں عام خاص
مطلق کی نسبت ہے۔ یعنی جو ملک امام صاحب کے مسلک پر دار الحرب ہو گا وہ صحابین
کے مسلک پر بھی ہو گا۔ لیکن جو ملک صحابین کے نزدیک دار الحرب ہو ضروری نہیں ہے

کہ امام صاحب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاعِ نفظی ہے، کیونکہ صاحبین محض اظہارِ احکامِ شرک کو جو دار الحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی، اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانہ کے خزانہ شاہی سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا۔ اور مندروں کے بجاویں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دست یاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ پس جب احکامِ شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہے تو احکامِ شرک کا مطلقاً اظہار دار الحرب ہونے کی بنیاد کیوں کر قرار پاسکتا ہے؟ اس بنا پر لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اظہارِ احکامِ شرک سے صاحبین کی مراد اہل شرک کا قہر و غلبہ اور ایسا استیلاء و استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور و مغلوب ہو جائیں۔ امام صاحب نے اظہارِ احکامِ شرک، جو ان میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلاء یا قہر و غلبہ اہل شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جدا گانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے۔ جسے صاحبین نے صرف ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اسی فتوے

زیر بحث میں فرماتے ہیں :

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ اس باب میں

یہ ہے کہ دار الحرب وہ ہے جو مقہور کفار

ہو اور دارالاسلام وہ ہے جو مقہور اہل

الحاصل این اصل کلی قاعدہ کلیہ

است کہ دار الحرب مقہور کفار است

و دارالاسلام مقہور اہل اسلام اگرچہ

دریک دار دیگر فریق ہم موجود باشد
 بلا غلبہ و قہر و آن جا کہ قہر
 اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار
 کے لوگ بھی بدون غلبہ و قہر کے آباد ہوں
 اور جس ملک پر دونوں فریق کا تسلط ہو
 وہ بھی دار الاسلام ہی سمجھا جائے گا۔
 خواہر بود۔

اس عبارت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک تین قسم کے ہیں :
 (الف) جس پر غیر مسلموں کا ایسا قبضہ ہو کہ مسلمانوں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔
 (ب) جس پر مسلمانوں کا ایسا قبضہ ہو کہ غیر مسلموں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔
 (ج) جس پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اقتدار اور تسلط حاصل ہو۔
 ان تینوں میں پہلا ملک دار الحرب ہوگا اور باقی دونوں دار الاسلام کہلائیں گے۔

استیلاءِ تام کی حقیقت :

پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ دار الحرب ہونے کا دار و مدار غیر مسلموں کے استیلاء سے تام اور
 ان کے بے شرکت غیرے غلبہ و قہر پر ہے تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ فقہاء کے نزدیک اس
 استیلاء اور غلبہ و قہر کا تحقق کب ہوتا ہے ؟ اور اس کا معیار کیا ہے ؟
 فقہانے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے
 نزدیک یہ استیلاء صرف اُس صورت میں متحقق ہوتا ہے جب کہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں
 کو کوئی کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو اور ان کو مذہبی آزادی بھی حاصل نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا
 کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو نظم و نسق میں دخل ہے۔ یا دخل تو نہیں ہے لیکن مذہبی آزادی
 بہر حال حاصل ہے۔ ان دونوں صورتوں میں "استیلاء" متحقق نہیں ہوگا۔ اور اس بنا پر وہ
 ملک شریعت کی اصطلاح میں دار الحرب نہیں کہلائے گا۔

اب ہم فقہاء کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے ہم نے استیلاء کے مفہوم اور حقیقت
 کی تعیین و تشخیص میں یہ جو کچھ کہا ہے اُس کی تائید ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے :

ان الامان ان كان للمسلمين
 اگر ملک میں مسلمانوں کو مطلق امان

فیہا علی الاطلاق والخوف للكفرة
 علی الاطلاق فہی دار الاسلام
 وان كان الامان فیہا للكفرة
 علی الاطلاق والخوف للمسلمین
 علی الاطلاق فہی دار الکفر ہے۔
 اور کفار کو مطلق خوف ہو تو وہ
 دار الاسلام ہے، اور اگر اس کے
 برعکس مکمل امان کفار کو ہو اور مطلق
 خوف مسلمانوں کو تو وہ دار الحرب
 ہے۔

یہ صورت ہوئی استیلائے تام کی۔ اب لیجیے وہ دو صورتیں جن سے اس کی نفی ہوتی
 ہے۔ تو ان میں سے پہلی یہ ہے کہ نظم و نسق میں دخل ہو، اس سلسلہ میں ردالمختار میں ہے:

لو اجريت احکام المسلمین
 واحکام اهل الشرك لا
 تكون دار حرباً۔
 اگر مسلمانوں اور اہل شرک دونوں کے
 احکام جاری ہیں (یعنی وہاں کی حکومت
 مشترک ہے) تو وہ ملک دار الحرب نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مذکورہ بالا عبارت میں صرف حکومت یا اقتدار
 میں شرکت کا ذکر ہے، اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ شرکت کس درجہ کی ہے۔ اس بنا پر اگر
 کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تب بھی وہ ملک دار الحرب نہیں ہوگا!
 مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو جنگ آزادی میں جمعیتہ علما کے سب سے بڑے
 سپہ سالار اور امیر کارواں تھے اس وسوسہ یا شبہ سے کیوں کر خالی الذہن ہو سکتے تھے؟ چنانچہ
 آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ پر کلام کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا
 کہ:

”اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت
 کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں، اور ان کے
 مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک
 بے شبہ دار الاسلام ہوگا، اور ان دونوں شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس
 ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ

کریں گے

اب وہی دوسری صورت یعنی یہ کہ مسلمان نظم و نسق مملکت میں کوئی عمل دخل تو نہ رکھتے ہوں لیکن ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ایسے ملک کے دارالحرب نہ ہونے کا اولین ماخذ ہجرت حبشہ ہے، جو نبوت کے پانچویں برس وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہاں مسلمان نہا بربن نہا بربت کو جو امن و امان اور آرام و اطمینان ملا صحابہ کرام نے اُس پر تشکر کا اظہار اس طرح کیا کہ اُنھیں دنوں میں نجاشی کے ملک پر کسی دشمن نے حملہ کیا اور خود نجاشی اُس کے لیے میدان میں اُترا تو ان صحابہ نے نجاشی کی فتح کے لیے دعا کی اور جنگ کے لیے خود اپنی خدمات پیش کیں یہ اس کے علاوہ ایک دوسرا ماخذ یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ہمیں کسی قبیلہ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ اگر تمہیں اس قبیلہ میں کوئی بُسی نظر آئے یا وہاں سے اذان کی آواز سنائی دے تو اُس پر حملہ نہ کرنا۔

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبیلہ کے ساتھ غزوہ کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہیں اُس کی عظیم اکثریت غیر مسلموں پر ہی مشتمل ہوگی۔ پھر اگر اس آبادی سے اذان کی آواز آتی یا وہاں کوئی مسجد نظر آتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اکاد کا مسلمان بھی آباد ہیں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ محض اس بنا پر حضورؐ کا اس قبیلہ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا حکم دنیا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان تعداد میں کتنے ہی کم سہی، لیکن اگر ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو اب یہ علاقہ ”دارالحرب“ نہیں رہا، ان دنوں ماخذوں کا اطلاق ان علاقوں پر ہوتا ہے جو اب تک دارالاسلام نہیں بنے ہیں، لیکن جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہے اُس کے دارالحرب نہ بننے کے ثبوت میں فقہانے ان دو ماخذوں کے علاوہ دو دلیلیں اور پیش کی ہیں، ایک یہ کہ جس حکم کا وجود کسی علت پر مبنی ہوتا ہے تو جب تک وہ علت بالکلیہ مرتفع نہیں ہو جائے گی۔ حکم مرتفع نہیں ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ

لے نقش جیات ج ۲ ص ۱۱۔ لے سیرت النبی، مولانا شبلی ج ۱ ص ۲۲۰۔ لے مسند امام احمد بن حنبل ترتیب سانی ج ۱۴

ص ۵۹۔ یہ روایت بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی سند کے اختلاف کے ساتھ ہے۔

ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ۔ اس بنا پر جس ملک میں بھی اسلامی زندگی کے تھوڑے بہت آثار و علامات موجود ہیں وہ دار الحرب نہیں ہو سکتا :

یہ جو لچھ عرض کیا گیا اس کو زمین میں رکھ کر اب آپ خود فقہا کی زبان سے ان کے بیانات سنئے :- سرخسی فرماتے ہیں :

”امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک ملک جو دار الاسلام رہ چکا ہے وہ دار الحرب اس وقت بنتا ہے جب کہ وہاں مشرکین کو مکمل قہر اور غلبہ ہو۔ اور مکمل قہر اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون نہ ہو۔“ اصل الفاظ یہ ہیں :

ان بقى فیہا مسلمٌ او ذمی آمنٌ
فذا لک دلیل عدم تمام
القہر منہم
اگر اس ملک میں ایک مسلمان یا ذمی بھی
مامون (امان سابق) ہے تو یہ اس کی دلیل ہے
کہ مشرکوں کو اس ملک میں مکمل قہر و غلبہ حاصل
نہیں ہے۔

صاحب در مختار ملتقی الابحر کی شرح میں لکھتے ہیں :

ولا تصیر دار الاسلام دار
الحرب الا بامور ثلاثة :
باجراء احکام الشریک
و باتصالها بدار الحرب و
بان لا یبقی فیہا مسلمٌ او ذمی
بالامان الاول یہ
محمد بن محمود الا شتر و سنی لکھتے ہیں :

والوحینۃ یقول : ان هذه
البلدۃ صارت دار الاسلام
اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں ”یہ ملک احکام
اسلام کے جاری ہونے سے دار الاسلام

لہ البسوط للسخی باب المزدین ج ۱۰ ص ۱۱۲۔ ۱۱۳ الدر المنقی فی شرح المنقی مخطوطہ

دار العلوم دیوبند ص ۲۵۵۔

ہو گیا تھا تو اب جب تک اس میں اسلام
کا کوئی ایک حکم بھی موجود ہے، وہ
دارالاسلام ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ
معلوم ہے کہ جب کوئی حکم ثابت ہو جاتا ہے
تو جب تک علت کا کچھ حصہ بھی باقی رہتا ہے
اُس کی بقاء سے حکم بھی باقی رہتا ہے۔

باجراء احکام الاسلام فیہا
فما بقی شیئ من احکام الاسلام
فیہا یبقی دار الاسلام علی ما
عرف ان الحكم اذا ثبت
بعد فما بقی شیئ من احکام
العلۃ یبقی الحكم ببقائه۔

اس کے بعد شرح سیر الاصل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابو بکر رحمہ اللہ نے بھی
یہی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں شیخ الاسلام نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ:

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب
نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں اسلامی
احکام میں سے کچھ بھی باقی ہو۔ اگرچہ
اہل اسلام کا ظہر نہ رہا ہو۔

ان دار الاسلام لا یصیر
دار الحرب ذابقی شیئ من
احکام الاسلام وان زالت
غلبۃ اهل الاسلام۔

پھر صدر الاسلام ابو الیسر کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب
نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب چیزیں
فنا نہ ہو جائیں جن کے باعث وہ
ملک دارالاسلام بنا تھا۔

ان دار الاسلام لا یصیر
دار الحرب ما لم یبطل
جمیع ما بہ صارت دار
الاسلام۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

اور شیخ الاسلام الاسیجانی نے اپنی
مبسوط میں بیان کیا ہے کہ جب دارالاسلام
پر دارالاسلام ہونے کا حکم لگ گیا تو اب
اگر ایک اسلامی حکم بھی باقی رہے گا تو یہ

و ذکر شیخ الاسلام الاسیجانی
فی مبسوطہ ان دار الاسلام
محکومۃ بكونها دار الاسلام
فبقی هذا الحكم ببقاء حکم

دارالاسلام ہونے کا حکم بھی باقی رہے گا
 اور امام لامسی نے اپنے واقعات میں
 بیان کیا ہے کہ ایک ملک جب تینوں
 علامتوں کے باعث دارالاسلام ہو گیا
 تو اب جب تک ان علامتوں کا ایک
 شتمہ بھی باقی ہے یہ ملک دارالحر نہیں
 ہوگا۔ اور شہید امام اجل ناصر الدین نے
 منشور میں لکھا ہے کہ ایک ملک جو احکام
 اسلام کے اجراء سے دارالاسلام بن گیا
 ہے تو جب تک کسی قسم کا بھی لگاؤ اس
 کو اسلام سے رہے گا جانب اسلام کو ہی
 ترجیح رہے گی۔ اور انھیں نے ملقط
 میں بیان کیا ہے کہ جو علاقے کفار کے قبضہ
 میں ہیں وہ بے شبہ اسلامی علاقے ہیں نہ کہ حریجی۔
 کیوں کہ یہ علاقے بلادِ حرب سے متصل
 نہیں ہیں اور پھر ان علاقوں کے علم انوں
 نے ان میں احکام کفر کو غالب نہیں
 کیا ہے۔

واحد فیہا و ذکر الامام
 اللامسی فی واقعاتہ ان صارت
 دارالاسلام بہذہ الاعلام
 الثلاثة فلا تصیر دار الحرب
 ما بقی شی منہا۔ و ذکر الشہید
 الامام الاجل ناصر الدین
 فی المنشور ان دارالاسلام
 صارت دارالاسلام باجراء
 احکام الاسلام فیما بقیت
 علقۃ من علائق الاسلام
 ترجیح جانب الاسلام و ذکر
 فی الملقط ان البلاد التي فی
 ایدی الکفار لا شک
 انہا بلاد الاسلام لا بلاد
 الحرب لانہا غیر متاخمة
 لبلاد الحرب ولا نہم لم
 یظہروا فیہا احکام
 الکفریہ

مذکورہ بالا عبارتوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا فقہائے کرام برابر یہ کہتے جا رہے ہیں
 کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی باقی ہوگا تو ملک دارالحر نہیں ہوگا، اب یہ بھی سن لیجیے کہ
 یہ ایک حکم جس کا بقا "عدم اظہار کفر" کی دلیل ہے فقہاء کے نزدیک اس کا معیار اور اس
 کی حد کیا ہے؟ یہی محمد بن محمود الحنفی الاشتهر و سنی فرماتے ہیں:

اس ملک میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا اور بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا جائز ہو۔

اور جن علاقوں پر حاکم کفار ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا گوارا ہے اور خود مسلمانوں کی آپس کی رضامندی سے وہاں قاضی بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ علت کے ایک جز کے بقا سے حکم باقی رہتا ہے اور ہم نے بلا خلاف کے یہ حکم کیا تھا کہ کفار کے استیلاء سے پہلے یہ علاقے دارالاسلام تھے اور ان کے استیلاء کے بعد اذان دینا۔ جمعہ اور جماعت اور شریعت کے مطابق حکم دینا۔ فتویٰ دینا اور درس دینا عام طور پر مرجح ہے اور کفار کے بادشاہوں کی طرف سے اس پر کوئی ٹوک ٹوک نہیں ہے۔ اس بنا پر ان علاقوں کو دارالحرب کہنے کی کوئی وجہ نہ عقلی ہے اور نہ نقلی اور شراب کا کھلم کھلا بیچنا اور خمر آ لینا اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی رسم کا توڑنا ان سب کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ بنو قریظہ کا اعلان یہودیت اور محمد صلی اللہ

يجوز فيه اقامة الجمعة و الاعياد وتزويج الايتامى۔

اسی سلسلہ میں فتاویٰ بزازیر میں ہے :
 واما البلاد التي عليها ولاية كفار فيجوز فيها ايضاً اقامة الجمع والاعياد والقاضي قاض بتراضي المسلمين وقد تقر بان بقاء شئ من العلة يبقى الحكم وقد حكمنا بلا خلاف فان هذه الديار قبل استيلاء الكفار كان من ديار الاسلام وبعد استيلاءهم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحكم بمقتضى الشرع و الفتوى والتدريس شائع بلا تكبير من ملوكهم فالحكم بانها من دار الحرب لاجتهت له نظراً الى الداراسة و الداراية۔ و اعلان بيع الخمر و اخذ الفرائب و المكوس و الحكم من النقص برسوم التتار كاعلان بنى قريظة

علیہ وسلم کے مقابلہ میں طاغوت سے
حکم کا طلب کرنا حضور م کے عہد مدنی
میں۔ اور بلاشبہ ان سب چیزوں کے
باوجود مدینہ بلاشبہ اسلام کا
شہر تھا۔

بالیہودیہ و طلب الحکم من
الطاغوت فی مقابلہ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم فی عہدہ بالمداینۃ و
مع ذالک کانت بلدۃ اسلام بلا
سابقہ۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات کو سامنے رکھنے سے جو نتیجہ بلا کسی دغذغہ اور خدشہ کے نکلتا
ہے وہ یہ ہے کہ صرف وہ ملک دارالحرب ہوگا جہاں کفر کا غلبہ اور استیلا پائیں معنی ہو کہ نہ تو
مسلمان اُس کی حکومت اور نظم و نسق میں شریک ہوں اور نہ ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو، یعنی
یہ دونوں چیزیں استیلاء و غلبہ کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس بنا پر یہ دونوں نہ ہوں یا ان
میں سے ایک نہ ہو بہر حال فوت البحر۔ فوت الكل کے قاعدہ کے مطابق استیلاء متحقق نہیں
ہوگا اور اس لیے حسب ذیل دونوں قسم کے ملک دارالحرب نہیں ہوں گے :

(الف) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت ہیں۔

(ب) وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت تو نہیں البتہ انھیں مذہبی آزادی
حاصل ہے۔

احتمال عقلی کے طور پر ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان شریک حکومت تو
ہیں۔ مگر ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہم نے اس صورت کا ذکر قصداً اس لیے نہیں
کیا ہے کہ اگر واقعی کسی ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مذہبی آزادی کے نہ ہونے کے باوجود
حکومت میں شریک ہیں تو وہ سچ مچ اس شعر کا مصداق ہیں :

اپنے ہاتھوں سے جو ڈھا آئیں خدا کے گھر کو
ننگِ اسلام ہے ایسوں کا مسلمان ہونا

اور ظاہر ہے اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک دارالحرب ہے یا دارالاسلام !



ہندوستان کی دستوری حیثیت

ہندوستان کی دستوری پوزیشن:

اب آئیے ہندوستان کی دستوری پوزیشن کا جائزہ لیں۔

اس پر غور کرنے سے پہلے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ آزادی کے اس پس منظر کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہے۔ دونوں نے یکساں قربانیاں دیں، جیل گئے۔ پٹے اور مارے گئے، جمعیتہ علما جو علمائے ہند کی نمائندہ جماعت تھی اُس نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور یہ سب کو معلوم ہے، کانگریس کا نصب العین آزادی کے بعد جمہوری نظام قائم کرنا شروع سے رہا ہے، اور علماء اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے بعد علمائے کرام کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوتی؟ وہ دارالہرب رہتا یا دارالاسلام؟ اگر دارالہرب ہوتا تو کیا علماء کے لیے جائز تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کو جو (انگریزوں کے زمانہ میں) دارالہرب نہیں تھا اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر دارالہرب بنائیں؟ اور اگر وہ دارالاسلام بنتا تو پھر تقسیم نے ملک میں اکثریت و اقلیت کے اعتبار سے آخر کو کسی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو دارالاسلام ہوتا اور اب تقسیم ہو گیا ہے تو یہ دارالہرب بن گیا۔ آخر دستوری طور پر وہ کونسی چیز ہے جو تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہوتی اور اب نہیں ہے اور اس بنا پر پہلی صورت میں شرعی حکم کچھ اور ہوتا اور اب کچھ اور ہوگا!

صوبائی طور پر آبادی کم و بیش ہوتی لیکن مرکز میں پوزیشن تو بہر حال یہی ہوتی جس کا ذکر مسلم لیگ بار بار کرتی تھی۔

بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتہ نہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا، اور اُس کی بنیاد پر ہی ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیش نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

جمہوریت :

اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے۔ مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے، مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اُس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ عام حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کے ذریعہ

پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا۔ اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی، اور اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اُس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی :

اب لیجے مذہبی آزادی! اس سلسلہ میں دستور اعلان کرتے ہیں کہ

(۱) ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (Conscience)

کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب

کو چاہیں مابین، اس پر عمل کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔

(۲) ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر۔

الف :- ادارے قائم کریں اور چلائیں۔

ب :- مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں۔

ج :- اس ادارہ کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔

د :- اور اس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں۔

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمائندوں کی طرف

سے ان کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا:

”جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے

ساتھ دو قالب و یک جان بنا دے گا۔“

ایک اور صاحب نے کہا:

”میں اکثریتی فرقہ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ

بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔“

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اس کی

تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی۔ بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ”حکومت مذہب کے معاملہ

میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے ان

میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا! ^۱

اقلیتوں کو طبعی طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ان کے بچے حکومت کے اسکولوں اور

کالجوں میں تعلیم پا کر کہیں ارتداد (indoctrination) کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ

سے اس اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(1) The Constitution of India. Part III Article 25, 26

(2) Constitution assembly debates vol. VII pp. 260-67.

(3) The Constitution of India Part III Article 28.

سپریم کورٹ :

اب سوال یہ ہے کہ دستور نے باشندگان ملک کو جو یہ حقوق دیے ہیں ان کی حفاظت اور نگرانی کون کرے گا۔ اور پھر اگر کسی دفعہ کی یا اُس کے کسی لفظ کی مراد اور اُس کی تشریح میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ دستور نے یہ سب اختیارات سپریم کورٹ کو دیے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اور پارلیمنٹ یہ سب دستور کے وفادار اور اُس کے پابند ہیں اور دستور کی تشریح و توضیح اور ظلم و زیادتی سے اُس کی حفاظت، یہ سب سپریم کورٹ کا حق ہے اور اس بنا پر گورنمنٹ بھی مجبور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں انڈین سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل کوکاسب راؤ (Koka Subba Rao) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ”سپریم کورٹ کا فرض یہ ہے کہ دستور نے جو بنیادی حقوق دیے ہیں کورٹ ان کے اور سماجی انصاف کے درمیان تطبیق و توافق رکھے اور ہیئت منتظمہ (حکومت) کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دے“ اسی بنا پر سپریم کورٹ کے لیے غیر جانبدار اور بے خوف ہونا ضروری ہے۔

دستور کا عمل پہلو :

اب غور کیجیے۔ دستور کی دفعہ جو شہری حقوق سے متعلق ہے وہ مسلمانوں کو حکومت کے کاروبار میں اکثریت کے ساتھ شریک کرتی ہے، اور مذہبی آزادی سے متعلق جو دفعہ ہے وہ ان کو مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی شعائر و رسوم کو بجالانے کی، مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی، مذہبی تعلیم اور دینی امور کو سرانجام دینے کی غرض سے خود اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو حکومت کی مداخلت کے بغیر چلانے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ شہری حقوق میں معاشی آزادی بھی شامل ہے اور اس لیے مسلمانوں کو اس بات کی بھی پوری آزادی حاصل

(1) The Constitution of India. Part III Article 32

ہے کہ حصولِ معاش کے لیے وہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں، ملازمت صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت، ان میں سے ہر ایک کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور کسی اعتبار سے کہیں کسی جگہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں لکھا گیا ہے، چنانچہ جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ صدرِ جمہوریہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو نائب صدر ایک مسلمان ہے۔ اسی طرح مرکز اور ریاستوں کی وزارتوں میں، سفارتوں میں، گورنروں میں، حکومت کے دفاتر میں چھوٹے ہوں یا بڑے۔ پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں میں، عدالتوں میں، کارخانوں اور کمپنیوں میں یونیورسٹیوں میں، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں، حکومت کی تشکیل میں ان کے ووٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، بلکہ بعض علاقوں میں تو ان کا ووٹ پانسنگ کی حیثیت رکھتا یعنی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اب رہی مذہبی آزادی! تو اس آزادی کی کوئی قسم ہے جو انھیں حاصل نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں مسجدیں ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہو کر فضا میں گونجتی ہے بعض بڑے بڑے شہروں کی خاص خاص مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور اس پر اذان ہوتی ہے، عیدِ بقرہ عید اور بعض اور مسلم تہواروں کی تعطیل حکومت کے کیلنڈر میں شامل ہے۔ ہر سال حج کے لیے کم و بیش سترہ اٹھارہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں اور اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے سلسلہ میں گورنمنٹ وہ سارے کام کرتی ہے جو اسلامی حکومتیں کرتی ہیں۔ حکومت کی مقرر کردہ دو مرکزی حج کمیٹیاں ہیں جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ پورے عملہ کے ساتھ حاجیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ میں اور حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں اور دواؤں کا انتظام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں سے حجاج کی عام خدمت کے لیے اسکاڈس الگ جاتے ہیں، اس سال زرمبادلہ کے سخت گھاٹے کے باوجود حکومت نے دو کروڑ روپیہ کا اکیچینج حاجیوں کے لیے منظور کیا، پھر مسلمانوں

کی مذہبی اور دینی تعلیم بالکل آزاد ہے، ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مدارس عربیہ اور ہزاروں مکاتب دینیہ ہیں جو بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کر رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ تقسیم سے پہلے اسی نوے ہزار ہوتا تھا اس سال اس کا بجٹ دس لاکھ روپیہ ہے۔ علاوہ انہی حیدرآباد کا دائرۃ المعارف جو اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کا سب سے اہم ادارہ ہے وہ اور اس کے علاوہ کلکتہ، پٹنہ اور رامپور وغیرہ کے بعض مدارس عربیہ تمام تر حکومت کے خرچ اور اس کے انتظام سے چل رہے ہیں۔ سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کے کسی ایک اسکالر کو بھی ہر سال صدر جمہوریہ کی طرف اعزاز ملتا ہے۔ تبلیغی جماعت، اسلامی جماعت اور دینی تعلیمی کونسل سب اپنے اپنے طریقہ پر کام کر رہی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

تقریباً تحریر کی آزادی :

ہمارا دستور اظہارِ مافی الضمیر کی گارنٹی دیتا ہے۔ تو مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا مسلم پریس جس آزادی اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات و مسائل اور ان کی شکایات و تکالیف کے بارہ میں لکھتا اور حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ بلاشبہ عرب اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کے اخبارات یہ جرات و جسارت نہیں دکھا سکتے۔

معاشی آزادی :

دستور معاشی آزادی کی جو ضمانت کرتا ہے۔ مسلمان اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ملک میں گھوم پھر کر دیکھیے انڈیا کے فضل و کرم سے صنعت و حرفت، تجارت، زراعت و فلاحت ان میں سے کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کا حصہ نہ ہو اور وہ ترقی نہ کر رہے ہوں۔ تقسیم کے بعد تباہی کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک نئی توانائی اور خود اعتمادی کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ ان کے اپنے بل بھی ہیں اور کارخانے بھی۔ بعض خاص خاص صنعتوں کے لیے اب تک ان کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، اور لکھ پتی بھی۔ دکاندار بھی ہیں اور بڑے بھی! مال درآمد بھی کرتے ہیں اور برآمد بھی! پھر کثرت

سے فارم اور باغات والے بھی ہیں جو اپنے ہاں کی خصوصی پیداوار پر گورنمنٹ سے
کئی کئی انعام لے چکے ہیں۔

شکایات :

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے شکایات بھی ہیں اور بعض بہت شدید
قسم کی! لیکن منطق کا مسلہ قاعدہ ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ اس
لیے ہم ایک سالبہ کلیہ بناتے ہیں اور وہ یہ کہ ”مسلمانوں کے ساتھ ہرگز کوئی انصاف نہیں ہو
رہا ہے“ لیکن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلیہ صحیح ہے پس جب یہ صحیح نہیں تو لامحالہ اس
کی نقیض یعنی موجبہ جزئیہ صحیح ہوگی اور اب قضیہ یہ ہوگا کہ ”مسلمانوں سے کچھ انصاف ہو
رہا ہے اور کچھ نہیں ہو رہا ہے“ اب دیکھنا یہ ہے کہ مکمل انصاف اور دستور پر مکمل
عمل کس کے حق میں ہو رہا ہے؟ آج آپ کو معلوم ہے۔ ملک کا کیا حال ہے؟ کونسی
بیماری ہے جو ہمارے سماج میں نہیں ہے۔ کونسا آزار ہے جس میں ہمارا معاشرہ مبتلا
نہیں۔ روگ کی وہ کونسی قسم ہے جو قوم کے رگ و پے میں ساری نہیں! آدمی پاگل ہوتا
ہے تو ماں باپ اور بہن بھائی پر بھی ہاتھ اٹھا بیٹھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو جو شکایات ہیں ان
کو ملک کے عام حالات کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ مسلمان ایک کل کا جز ہیں۔
جب کل ہی صحت مند نہیں تو جز صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ ملک کے مختلف طبقات
میں اگر ذات پات کے، زبان کے اور علاقائی حد بندی کے تعصبات پائے جاتے
ہیں، اور ان کی بنیاد پر آئے دن شکست و ریخت اور حرب و ضرب کے ہنگامے برپا
رہتے ہیں تو اگر مذہب کے نام پر بھی مفسدہ پردازوں کے ایک گروہ نے من مانی کرنے
کی ٹھان لی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بہر حال ملک کی عام ناگفتہ بہ اور تباہ کن
صورت حال کے اصل اسباب حکومت کی نااہلیت اور کمزوری اور عوام میں جمہوریت کی
قدروں کا عدم احساس ہی دو ہیں۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جو شکایات
ہیں اُس کے اسباب بھی یہی ہیں، اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں کو جو شکایات ہیں
وہ محض اس لیے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں! معاشرہ میں جب تک فساد ہے مسلمانوں کو بحیثیت

ایک فرقہ کے قابل اطمینان کبھی نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ جب سدھ جائے گا تو مسلمانوں کو بھی اطمینان ہو جائے گا اور مسلمانوں کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے آپ کو سدھار لیں تو معاشرہ کے سدھارنے میں بھی وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں دستور نے جو حقوق مسلمانوں کو دیے ہیں ان پر اگر کہیں کوئی زد پڑتی ہے تو اُس کے خلاف احتجاج کرنا یہ مسلمانوں کا آئینی حق ہے وہ انھیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ احتجاج کے حق کا آئینی ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اس ملک کے شہری حقوق میں کسی سے کم نہیں، بلکہ برابر ہیں۔ مغلوب نہیں بلکہ شریک ہیں۔ محکوم نہیں بلکہ ساتھی ہیں۔

اندیشے اور خدشے:

شکایات کے علاوہ بعض اندیشے اور خدشے بھی ہیں۔ مثلاً بعض مسلمان کہتے ہیں کہ بے شبہ اس وقت تو مسلمانوں کو مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل ہے لیکن دستور میں ایک دفعہ جس میں کہا گیا۔ ہے کہ اسٹیٹ تمام ملک میں ایک ہی سول قانون رائج کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں کے پرسنل لا کا کیا حال ہوگا؟ اور پھر مذہبی آزادی کہاں رہے گی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب میں وزیر قانون اعلان کر چکے ہیں کہ سول کوڈ کسی فرقہ پر زبردستی تھوپا نہیں جائے گا۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ملک کے لیے جو عام سول کوڈ بنے گا وہ اسلامی قوانین کے خلاف ہی ہوگا۔ ممکن ہے وہ اسلام کے مطابق ہو جیسے ہندو کوڈ بل کی متعدد دفعات اسلامی تعلیمات کا چہرہ بہر ہیں۔ اور پھر اگر اُس میں کوئی بات مسلم پرسنل لا کے خلاف ہوئی بھی تو آپ کو پورا حق ہے اُس کے خلاف آواز اٹھانے اور اگر ضرورت ہو تو سپریم کورٹ کو کھٹکھٹانے کا! یاد رکھیے یہ حق سب مسلم ممالک میں بھی نہیں ہے۔

بہرحال فقہاء نے دارالحرب کی تعریف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں

دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے ان سب کو پیش نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں:

(۱) ہندوستان چونکہ ایک سکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے، اس بنا پر فقہاء کی اصطلاح میں ”غلبہ کفر“ یہاں صادق نہیں آتا۔

(۲) شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

(۳) مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۴) مسلمانوں کو معاشی اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

(۵) انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے کم۔ کسی سے زیادہ!

(۶) انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکو تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے۔

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ دارالہرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ ”استیلاء“ میں جمع ہو گئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لیے ہندوستان ہرگز نہ دارالہرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دارالہرب ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ اور تو اور پاکستان کے دو نامور محقق اور فاضل اسلامیات نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متعلق استفتا اور دارالعموم دیوبند کے دارالافتا کی طرف سے اس کا جواب (جس کا ان صفحات میں ذکر کیا ہے) پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہندوستان اور اسی بی بی وائی بی بی ہورنٹول

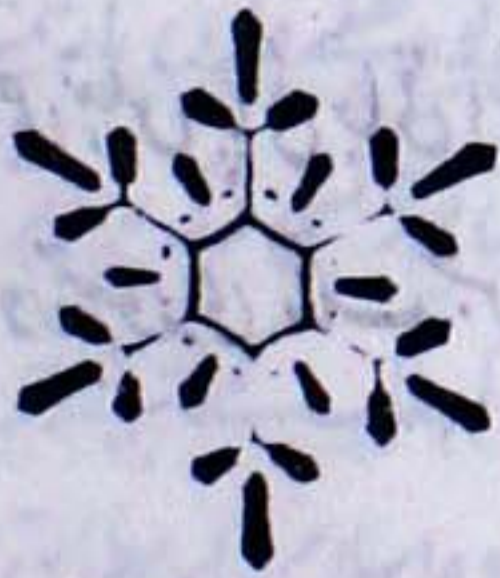
لے اور اب تو ہندوستان کا مشرقی سرحد پر بھی ایک مسلمان ملک (بنگلادیش) بن گیا ہے۔ (شاہجہان پوری)

کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں :

”دار الحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ نیز قرونِ اولیٰ میں دار الحرب و دار الاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کو جہاں بد نظمی نہیں۔ بلکہ ایک خاص نظام قائم ہے اور مسلمان با امن و امان رہتے ہیں۔ بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں دار الحرب قرار نہیں دیا جاسکتا۔“

دوسرے صاحب پر وفیسر محمد شریف مرحوم ہیں جنہوں نے لکھا ہے :

”ہندوستان کا دستور اگرچہ سکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو اسلام دیتا ہے۔ اس بنا پر لفظوں کا فرق ہے۔ — ورنہ پاکستان کی اسلامی ریاست اور ہندوستان، اسٹریلیا اور امریکہ کی سکولر اسٹیٹ، یہ سب ایک ہی ہیں۔“



۱۔ ماہنامہ الریحیم سیدرا آباد (مغربی پاکستان) بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۷۱ و ۷۲۔

(2) Islamic and Educational Studies. P.6. (Institute of Islamic Culture, Lahore)

دار اور اس کی قسمیں

چند مغالطے اور ان کی وضاحت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان دار الحرب نہیں ہے تو کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں جو دو عام مغالطے پیش آتے رہے ہیں انہیں دور کر دیا جائے:

دارالاسلام اور دارالحرب میں نسبت کونسی ہے؟

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اسلام میں دار دوہی ہیں، ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب اور ان دونوں میں نسبت تناقض کی ہے۔ یعنی اگر کوئی ملک دارالاسلام نہیں تو وہ دارالحرب ضرور ہوگا اور اسی طرح اگر وہ دارالحرب نہیں تو لازمی طور پر دارالاسلام کہلائے گا۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو ہمارے علماء کو شروع سے آج تک پیش آتی رہی ہے اور اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن ممالک پر درحقیقت نہ دارالحرب کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ دارالاسلام کی (مثلاً انگریزوں کے زمانہ کا ہندوستان کہ اُس میں مذہبی آزادی اور معاشی آزادی تو تھی لیکن اسلام کا قانون نافذ نہ تھا، اُن کے متعلق علماء میں اختلاف پیدا ہو گیا، کسی نے اُن کو دارالحرب کہا اور کسی نے دارالاسلام اور کسی نے کوئی ایک دو ٹوک بات کہنے سے انکار ہی کر دیا، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ان دونوں میں نسبت تناقض کی نہیں جو ایک کا ارتفاع دوسرے کے وجود کو مستلزم ہو، بلکہ یہ دونوں وجودی ہیں اور ان بنا پر ان میں تضاد کی نسبت ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک دارالحرب بھی ہو اور دارالاسلام بھی۔ البتہ ایک ملک ایسا ہو سکتا ہے کہ نہ دارالحرب ہو اور نہ دارالاسلام۔

کیا دارالعهد و الامن دارالحرب کے اقسام ہیں :

دوسرا مغالطہ جو دراصل پہلے مغالطہ کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ ہے یہ ہے کہ دارالحرب سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ دارالحرب دارالامان بھی ہو سکتا ہے اور دارالعهد بھی۔ چنانچہ مولانا محمد سہول سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند مولانا گنگوہی کے مذکورہ الصدر فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”واقعات معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے۔ یعنی جس طرح حبشہ قبل ہجرت شریف کے باوجود دارالحرب ہونے کے دارالامان تھا اسی طرح سے آج کل ہندوستان بھی دارالامان ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔“

اس دعویٰ کے ثبوت میں فتح الباری اور اشعة اللمعات سے دو جہازیں نقل کرنے کے بعد بطور حاصل بحث کے لکھتے ہیں :

”خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے اول مدینہ منورہ ہی دارالاسلام بنا ہے اور اُس کے قبل دو ہی قسم کے دارالحرب تھے۔ دارالامان جیسے حبشہ اور دارخوف و شتر جیسے مکہ مکرمہ!“

یہی رائے مولانا محمد میاں مراد آبادی کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اُس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے ماتحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو دارالاسلام نہیں ہے۔“

اس کے بعد حبشہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”لیکن ہر دارالحرب سے نکل جانا ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

غلط فہمی کی بنیادی وجہ :

اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ ایک اور عام غلط فہمی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارہ میں ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام اور کفر میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی اور یہ دونوں طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے باہم متخارب ہیں اس بنا پر جس ملک میں کفر کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوگا وہ طبعی طور پر دارالحرب ہی ہوگا، لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں، ایک ہے نفسِ ایمان اور کفر کا باہمی تعلق اور دوسری ہے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دنیوی اور معاشرتی تعلقات اور روابط۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے

اور ان میں مسالمت یا مصالحت ممکن نہیں ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات و روابط کا تعلق ہے تو اس میں بڑی وسعت ہے، اس کے متعدد اقسام و انواع ہیں اور معاشرتی و سماجی زندگی میں اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہی اعلیٰ اخلاق و فضائل برتنے کا حکم دیتا ہے جن کا حکم وہ مسلمانوں کے ساتھ برتنے کا دیتا ہے، اسلام وحدۃ انسانیت کا بھی داعی ہے اور مساواتِ انسانی کا بھی، جس طرح اسلام کا خدا رب العالمین ہے اسی طرح اس کا پیغمبر رحمتہ للعالمین ہے۔ پھر یہ کیوں کہ ممکن ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کو اصلاً باہم متخارب اور عہد و صلح کو ایک ”امر عارض“ قرار دیا جائے اور اسی ایک بنیاد پر دعویٰ کیا جائے کہ غیر مسلموں کا ملک اصلاً ”دارالحرب“ ہوگا۔ اس فرق کو آپ اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شرک کو قرآن نے نجاست کہا ہے مگر مشرک کو جسمانی اور مادی اعتبار سے نجس کوئی نہیں کہتا۔ چنانچہ اس کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا اور ایک ہی مکان میں رہنا سہنا سب جائز ہے۔

ہم نے اوپر دار کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں ان میں پہلی قسم یعنی دارالاسلام تو خارج از بحث ہی ہے۔ اب رہیں باقی تین قسمیں تو اب ہم قرآن مجید اور تاریخ و سنت سے ان کا ثبوت پیش کرتے ہیں :

اس سلسلہ میں ہمیں امورِ ذیل پر غور کرنا چاہیے :

(الف) اندرونِ قرآنِ غیر مسلموں کے ساتھ اصل حربے یا صلح و آشتی؟ اسی کو آج کل کی

اصطلاح میں ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام پر امن حیاتِ باہم

(peaceful co-existence) یا "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" (live and let live)

کا قائل ہے یا نہیں؟

(ب) اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

کی کتنی قسمیں ہیں؟ اگر ایک نہیں بلکہ کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم اپنی ایک مستقل حیثیت

رکھتی ہے اور کوئی قسم کسی دوسری قسم کی تابع نہیں تو اس سے خود بخود یہ ثابت

ہو جائے گا کہ تعلقات کی جتنی قسمیں ہیں اتنی ہی غیر مسلم ممالک کی قسمیں ہوں گی

اور وہ سب مستقل بالذات ہوں گی۔

پر امن بقائے باہم :

اب آئیے پہلے اس پر بحث کریں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ

میں اصل حرب کو قرار دیتا ہے یا پر امن بقائے باہم کو، ہر شخص جس نے قرآن پر ایک نظر

بھی ڈالی ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن میں فتنہ و فساد، شرانگیزی اور ظلم و جور کی جگہ

جگہ سخت مذمت اور فتنہ انگیزوں کے لیے شدید وعید بیان کی گئی ہے یہاں تک کہ

فرمایا گیا :

الْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۗ فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت (یعنی ناقابلِ برداشت) ہے

ایک مسلمان اور غیر مسلم میں مذہب کے سوا اور کسی چیز کا اختلاف نہیں ہے۔ اس بنا پر

مذہب کی تبلیغ اور اس کی طرف دعوت جس طرح ہر انسان کا ایک طبعی حق ہے مسلمان کا

بھی ہے۔

ساری دنیا کا ایک مذہب نہیں ہو سکتا :

لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک یہ کہ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز میں بہاں تنوع اور رنگارنگی ہے اسی طرح مذہب بھی کبھی ایک نہیں ہو سکتا اور اُس میں اختلاف و تنوع برابر قائم رہے گا۔ پناچہ حضور پر نور کو خطاب کر کے فرمایا گیا :

(۱) وَكُوشَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ - وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ ۙ

اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک اُمت ہی بنا دیتا اور یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا ہے، اور اسی کے لیے ان کو پیدا کیا ہے۔

(۲) وَكُوشَاءَ رَبُّكَ لَا مَن مِّنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَبِيحًا عَافَانَتْ تَكْرِيهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۙ

اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں وہ سب ہی ایمان لے آتے تو کیا (پھر بھی) آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اگرچہ ان لوگوں کی روگردانی آپ پر بہت شاق ہے لیکن اگر آپ کے بس میں ہے تو (جائیے) زمین میں کوئی شترنگ یا آسمان کے لیے کوئی زمین تلاش کر لیجیے اور ان لوگوں کے لیے ایک نشانی لے آئیے جسے دیکھ کر سب ایمان لے آئیں، اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر ہی دیتا۔ پس آپ نادان نہ بنیں۔

(۳) وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِبَيِّنَاتٍ مِّنْ لَّدُنَّا فَكُلُّهُمْ أُمَّةٌ عَلَىٰ الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۙ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ عام لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا :

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِن لَّا يَشَاءُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَ النَّاسَ أَمَّا يَشَاءُ ۚ

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا۔

لیکن خدا نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں وہ تمہارا امتحان لیتا ہے اس لیے نیکیوں میں مسابقت کرو، خدا ہی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے اور پھر دنیا ^{میت} میں (ہن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے خدا ان سے تم کو آگاہ کرے گا۔

وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ
فِيمَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرَاتِ ط إِلَى اللَّهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَبِئْسَ
بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ -

ان آیات کا منشا یہ ہے کہ جب یہ اختلاف ادیان و مذاہب بحکم مشیت ایزدی قائم اور برقرار رہے گا ہی تو تبلیغ و دعوت الی اللہ جو تمہارا فرض ہے وہ انجام دیے جاؤ لیکن محض اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی سے شخصی مخالفت اور دشمنی رکھنا دین حق کی تعلیم نہیں ہے۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا بہر حال قابلِ نفرت ہے اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن جو شخص آپ کے خیال میں مریض ہے وہ آپ کی نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔

مذہب میں جبر و اکراہ نہیں ہے:

اور دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات کے پہلو بہ پہلو ہی وہ آیات ہیں جن میں حضورؐ کو خطاب کر کے صاف صاف فرمایا گیا کہ آپ صرف تبلیغ ہیں، مذکر ہیں، آپ نہ ان لوگوں پر مسلط ہیں اور نہ آپ ان کے اجارہ دار ہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ مذہب میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا۔ حق اور ناحق دونوں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے۔ جو جیسا کرے گا خدا کے ہاں ویسا ہی پائے گا۔ چنانچہ آیات ذیل پر غور فرمائیے:

پس آپ نصیحت کیجیے، آپ نصیحت کرنے والے ہی ہیں آپ ان پر مسلط نہیں ہیں مگر ہاں جو شخص سرکشی اور کفر کرے گا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ بے شبہ ہماری ہی طرف ان سب کو آنا

فَذَكِّرْنَا نَبَاً أَنْتَ مُذَكِّرٌ
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصِيطِرٍ إِلَّا
مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ
الْعَذَابَ الْكَبِيرَ إِنَّ إِلَيْنَا

ایَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا
حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ، آیت ۲۱ تا ۲۲) ہے۔

یہ آیات مکی ہیں جب کہ مسلمان کمزور اور تعداد میں بہت کم تھے، لیکن مدنیہ میں جب ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ایک عظیم الشان طاقت و قوت کے مالک تھے، وہاں بھی تبلیغ کے سلسلہ میں جو احکام نازل ہوئے وہ سب یہی تھے، چنانچہ مدنی آیات میں:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا
الرَّسُولَ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا
عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا
حُمِّلْتُمْ وَإِن تُطِيعُوا تَهْتَدُوا
وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ
الْمُبِينُ ۝ (النور، آیت ۵۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول
کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر یہ لوگ روگردانی کریں
تو پھر پیغمبر اپنے بوجھ کا ذمہ دار ہے اور تم لوگ اپنے
بوجھ کے، اور اگر تم پیغمبر کی اطاعت کرو گے تو
ہدایت پا جاؤ گے اور پیغمبر کے ذمہ تو صرف
صاف صاف پہنچا دینا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ
الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ آیت ۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے
ستمایز ہو گئی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ
اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيمِ ۝ (التوبہ آیت ۱۲۹)

اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو راسے محمدؐ آپ کیسے:
”میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور
معبود نہیں ہے، میں نے اُس پر ہی بھروسہ کیا ہے
اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔“

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں جبر و اکراہ کی نفی ہی نہیں کی
گئی بلکہ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ جو ایمان جبر و اکراہ سے قبول کیا جائے اور اُس میں

دل کی خواہش اور رضامندی کو دخل نہ ہو اُس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پس جب زبردستی کا ایمان معتبر ہی نہیں ہے تو پھر جبر و اکراہ کی اجازت کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ارشادِ حق بنیاد ہے :

پس جب ان لوگوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو بولے
 ”ہم ایک خدا پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں
 کو خدا کے ساتھ ہم شریک مانتے تھے اب ہم ان
 کا انکار کرتے ہیں“ لیکن ہمارا عذاب دیکھنے پر ان
 کا ایمان لانا ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوا۔ اللہ کی
 اپنے بندوں کے ساتھ دیرینہ سنت یہی ہے
 اور ایسے مواقع پر کافر بہت نقصان اٹھاتے
 ہیں۔

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا
 بِاللَّهِ وَخَدَاةَ وَكَفَرْنَا بِمَا
 كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ۝ فَلَمْ
 يَكُ يَنْفَعَهُمْ إِيْمَانُهُمْ
 لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ
 الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۝
 وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ۝
 (مومن، آیت ۸۵)

عذابِ الہی کی طرح موت بھی ایک جبر ہی ہے اس بنا پر جس طرح نزولِ عذاب کے
 وقت ایمان لانا معتبر نہیں تھا اسی طرح موت کے شکنجہ میں پھنس کر ایمان کے اقرار کا کوئی
 اعتبار نہیں ہے، چنانچہ فرمایا گیا :

اور توبہ ان بدکاروں کی معتبر نہیں ہوتی جن کا حال
 یہ ہوتا ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت
 آتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے ”میں نے اب
 توبہ کر لی ہے“

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ
 يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا
 حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ:
 إِنِّي تُبْتُ اللَّهَ ۚ (النساء، آیت ۱۸)

اگر اسلام میں جبر بائز ہوتا تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غیر مسلم غلام کو
 مسلمان بناتے۔

اب شر و فساد، ظلم و جور کی مذمت و حدت انسانیت، مساواتِ انسانی اور عدل و
 انصاف کی تاکید کے بارہ میں جو آیات ہیں ان کو مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ملا کر پڑھیے
 تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض اختلافِ مذہب کے باعث غیر مسلموں کے ساتھ ان

مکارم اخلاق اور فضائلِ علیا سے گر کر معاملہ کرنا جن کا حکم اسلام دیتا ہے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ بنوں کا سب و شتم، مذاق اڑانا، پھبتی کسنا، نام بگاڑنا تک جائز نہیں ہے۔ پس جب یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر غیر مسلم کو جو مسلم مملکت میں نہیں رہتا اُس کو حُرّی اور اُس کے ملک کو بہر حال دارالْحَرَب کہا جائے۔ اسی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام ”پُر امن بقائے باہم“ کا سرگرم حامی اور داعی ہے اور اُس کے فلسفہ حیات میں اصل امن و امان، مصالحت و مسالمت ہے اور جنگ فقط ایک امرِ عارض و زوال پذیر ہے ٹھیک اسی طرح جیسے صحت، خوشی، نیکی زندگی کی اصل حقیقتیں ہیں اور ان کے بالمقابل مرض، درد و غم اور بدی عارضی امور ہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں دنیا کے سب لوگوں کے ساتھ امن و امان اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کا عہد و پیمانہ کرنے کا حکم صاف لفظوں میں دیا گیا ہے اور اس راہ میں جو دوساوس و خطرات پیش آتے ہیں ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا
 فِي السَّلَامِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا
 خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّهُ لَكُمْ
 عَدُوٌّ مُّبِينٌ ٥ (البقرہ رکوع ۲۵۶) دشمن ہے۔

ضرب و حرب اور قتال کا حکم :

مرض، درد و غم اور بدی امورِ عارضی سہی لیکن بہر حال یہ بھی اس دنیا کی حقیقتیں ہیں۔ اور جب تک ان سے حفاظت اور بچاؤ اور کم از کم ان پر قابو پانے کا بندوبست نہ ہو زندگی میں سکھ اور چین میسر نہیں آسکتے، اس بنا پر اگر انسان کے لیے فرشتہ بننا ممکن نہیں ہے تو جنگ بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن میں جنگ کے احکام و مسائل اور اُس کے متعلقات کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جنگ کا مقصد فتنہ و فساد کی

بیخ کنی ہے اور یہ فساد خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اور غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف دونوں طرح ہو سکتا ہے، قرآن نے ان دونوں قسموں کو بیان کر کے ان کے احکام بھی بتائے ہیں، پہلی قسم کے متعلق ارشاد ہے :

وَإِنْ كَانَتَا مِنِ الْمُؤْمِنِينَ
اقتتلوا فأصلحوا بينهما
فإن بغت إحداهما على
الأخرى فقاتلوا التي تبغي
حتى تفيء إلى أمر الله -
(الحجرات ركوع ۱)

اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ بیٹھیں
تو تم ان کے درمیان صلح و صفائی کرا دو، لیکن
اگر ایک گروہ نے دوسرے گروہ پر زیادتی کی
ہے تو اب تم اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی
کر رہا ہے، اور اس وقت تک جب تک یہ
گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے۔

اس آیت میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں :

(الف) دونوں گروہ کسی غلط فہمی یا اجتہادی خطا کے باعث لڑ رہے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں میں غلط فہمی رفع کر کے، صلح و صفائی کرائی جائے۔

(ب) ایک گروہ حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔ ایک مظلوم ہے اور دوسرا ظالم؛ اس کا یہ حکم ہے کہ ظالم سے جنگ کی جائے اور اسے انتہا تک پہنچایا جائے۔

اور اگر یہ فساد اور شر غیر مسلموں کی طرف سے ہو تو پھر ان سے بھی جنگ کرنی چاہیے۔ لیکن اسلام کے فلسفہ اخلاق میں جنگ کی حیثیت ”علاج بالمثل“ یا ”بجزاء سینیۃ سینیۃ مثلھا“ کی ہے۔ اس بنا پر حکم ہے کہ مقصد جب حاصل ہو جائے تو فوراً ہاتھ روک لو اور ہرگز حد سے آگے قدم نہ رکھو، ورنہ خدا کے ہاں سخت پکڑ ہوگی۔ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے :

(۱) وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ
يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تم ان لوگوں
سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور
زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں

کو پسند نہیں کرتا۔
اور جس نے تم پر دست درازی کی ہے تم
بھی بس اتنی دست درازی اُس پر
کرو۔

البقرة - (رکوع ۲۴)
(۲) قَبْنَ اَعْتَدَايَ عَلَيْكُمْ
فَاَعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ
مَا اَعْتَدَايَ عَلَيْكُمْ (البقرہ رکوع ۲۴)

اور اگر تم ان کو عذاب دینے لگو تو
بس اتنا عذاب دو جتنا کہ تم کو دیا گیا تھا۔

(۳) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهِ ط (النحل - رکوع ۲۶)

اس سے بڑھ کر حسن اخلاق - شرافت نفس اور لطف و کرم کی دلیل اور کیا ہو سکتی
ہے کہ اگرچہ اس آیت میں برابر برابر بدلہ لینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی صبر کا
مرتبہ بہت اونچا بتایا گیا ہے :

اور اگر تم صبر کرو تو بے شبہ وہ صبر کرنے والوں

وَلٰكِنَّ صَبْرًا لَّهُمْ خَيْرٌ

کے لیے سب سے بہتر ہے۔

بَلِّغُوا بَيْنَهُمْ غَيْرِ مُسْلِمِينَ کی قرآن میں تین قسمیں :

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد کیا ہے ؟ وہ کیوں مشروع کی

گئی ہے ؟ اور اُس کے کیا حدود ہیں ؟ تو اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ قرآن میں غیر مسلموں

کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں جنگ، صلح اور امن کی تین حالتیں بیان کی گئی
ہیں، انھیں تین حالتوں کے اعتبار سے اُن کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے لیے الگ
الگ احکام ہیں اور انھیں احکام کی وجہ سے غیر مسلم ممالک تین قسم کے داسرا پر تقسیم
ہوتے ہیں۔

اہل مرئج و مرئجان :

ایک قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا نہ کوئی معاہدہ ہے اور نہ

جنگ۔ یہ لوگ مرئج و مرئجان قسم کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے

دوستانہ تعلقات نہیں ہیں تو یہ ان کے درپے آزار بھی نہیں ہیں۔ یہ نہ خود ستاتے ہیں

اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں شریک ہیں۔ مسلمانوں کو صاف حکم ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور لطف و کرم کا معاملہ کریں۔ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمْ اللّٰهُ عَنِ الدّٰيِنِ لَمْ
يَقَاتِلُوْكُمْ فِي الدّٰيِنِ وَلَمْ
يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ
اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتَقْسُوْا
اِلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ يَحِبُّ
الْمُقْسِيْنَ ۝

اے مسلمانو! جن لوگوں نے مذہب کی بنیاد پر تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو ترکِ وطن پر مجبور نہیں کیا اللہ تعالیٰ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرو، بے شبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جو حضرات قرآن کے اسلوبِ کلام کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس آیت میں اگرچہ لفظ ”لا ینہاکم“ کے ہیں جس سے محض اباحت اور اجازت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے لیکن درحقیقت مراد وجوب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ایک دو نہیں متعدد مواقع پر ”لا جناح“ بولا گیا ہے اور وجوب مراد ہے۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے :

فَاِنْ اَعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يَقَاتِلُوْكُمْ
وَالْقَوٰءِ يَكُمْ السَّلٰمُ
فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ
سَبِيْلًا ۝

پھر اگر وہ لوگ تم سے دو چار نہ ہوں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کے خواہاں ہوں تو خدا تم کو ان پر توہین جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

اربابِ عہد و صلح :

دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جن سے مسلمانوں کا عہد و پیمان ہے، اس سلسلہ میں اسلام کے احکام بالکل صاف و صریح یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عہد و پیمان کی پابندی صورت اور معنی دونوں کے اعتبار سے کرنی چاہیے، عہد شکنی، عذر، خیانت اور فریب دینا

پہلے درجہ کے معاصی کبیرہ میں سے ہے بلکہ یہاں تک علم ہے کہ اگر مسلمانوں کو کن
پہن بھی اس بات کی پہونچے کہ غیر مسلم دھوکا دینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اُس وقت بھی
وہ اللہ پر بھروسہ کریں۔ اور اپنی طرف سے پہل اُس وقت تک نہ کریں جب تک
وہم وطن یقین سے نہ بدل جائے۔

پہنچا ارشاد ہوا :

وَإِنْ جَاحُوا لِلسَّلَامِ فَاْجُنَحْ
لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ
هُوَ السَّيِّعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ
يُرِيدُ وَأَنْ يَخْذَ عُوْكَ
فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ط

اور اگر وہ لوگ تم سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں
تو (اے محمد) آپ اُن سے صلح کر لیجئے اور اللہ
تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے، بے شبہ وہ سننے
اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینے
کا ارادہ کریں تو (آپ پر اہ نہ کریں) بس اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا :

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمْ
السَّلَامَ كَسْتُمْ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ
عَرْضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ
مَغَانِمٌ كَثِيْرَةٌ ط كَذٰلِكَ
كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْكُمْ يٰٓ

اور جو شخص تم سے سلامتی اور صلح کی درخواست کرتا
ہے اُس سے تم یہ نہ کہو کہ تو ایمان دار نہیں ہے،
تم اس دنیا کے ساز و سامان کی طلب کرتے ہو
در آں حالیکہ اللہ کے پاس بڑی بڑی نعمتیں ہیں تم
(اسلام سے پہلے) ایسے ہی (دنیا پرست) تھے۔
پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو عہد و پیمان ہوتا ہے، خدا نے اُس کو خود اپنا عہد
کہا ہے، اور اس بنا پر اُس پر ثابت قدم رہنے کی سخت تاکید کی ہے :

وَآَوْفُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ إِذَا
عَاهَدْتُمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاٰيْمَانَ

اور جب تم معاہدہ کرو تو اللہ تعالیٰ کے عہد کو
پورا کرو، اور قسموں کو موکد کرنے کے بعد اُن کو

۱۱ سورہ الانفال - رکوع ۱ - آیت ۶۱ - ۶۲ - سورہ النساء رکوع ۱۳ -

نہ توڑو، در آں حالیکہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو کفیل بنا لیا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک اللہ اس کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اُس عورت کی طرح مت بنو جو اپنا سوت کا تنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دے کہ لگو تم اپنی قسموں کو اس وجہ سے فساد کا سبب بنانے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ طاقت ور ہے۔

بَعْدًا تَوَكِّدًا هَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ
اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ
اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَعْمَلُونَ ۝ وَلَا
تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ
غَزْلَهَا مِنْ ۚ بَعْدِ قُوَّةٍ
أَنْكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ
دَخْلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونُ
أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ۗ

غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر ان غیر مسلموں کے خلاف کچھ مسلمان بھی مدد طلب کریں تو حکم ہے کہ ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے :

اور اگر وہ (مسلمان) دین کے معاملہ میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ البتہ ہاں اُس قوم کے خلاف نہیں جن میں اور تم میں عہد و پیمان ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

وَإِنْ اسْتَنْصَرُواكُمْ فِي
الْدِّينِ فَعَلَيْكُمْ النَّصْرُ
إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَهُمْ
وَمِيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ ۝ الانفال: ۷۱

اس آیت میں اگرچہ لفظ ”قوم“ کا ہے جس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں پر ہو سکتا ہے، لیکن ”فی الدین“ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں قوم سے مراد غیر مسلم ہی ہیں، کیوں کہ مسلمان دین کے معاملہ میں جس مدد کے خواہاں ہیں وہ غیر مسلموں کے ہی خلاف ہو سکتی ہے۔

۱۔ النحل - ۹۱-۹۲۔ عہد جاہلیت میں قریش کا طریقہ یہ تھا کہ جس قبیلہ کو زیادہ طاقت ور

پایا اس سے معاہدہ کر لیا اور پھر اگر اس سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی اور قبیلہ ملتا تو اس سے عہد پیمان کر لیا اور پہلا

معاہدہ توڑ دیا، اس آیت میں اس طریقہ کی مذمت اور معاہدہ کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے۔

ایک اور آیت میں خاص مشرکین سے معاہدہ کا تذکرہ ہے :

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدُوا تُحْمِنَ
 الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوا
 شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ
 أَحَدًا فَأَتُوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ
 إِلَىٰ مَدَائِنِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يَجِبُ
 لِلْمُؤْمِنِينَ ۝

مگر ہاں جن مشرکین کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا
 ہے، پھر ان لوگوں نے تمہارا کوئی حق کم نہیں
 کیا ہے، اور تمہارے برخلاف کسی کی مدد بھی
 نہیں کی ہے تو (اے مسلمانو) تم اس معاہدہ کی
 مدت تک اس کو پورا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ
 پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں مسلمانوں کو معاہدہ کی پابندی کا حکم جس
 تاکید اور قوت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر
 کس طرح عمل کیا؟ اس کا اندازہ صلح حدیبیہ کے اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابھی
 صلحنامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو کا بیٹا ابو جندل زنجیروں میں
 گھسٹتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ سے مدد طلب کی، لیکن
 چونکہ صلحنامہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مکہ سے اگر کوئی مسلمان بھاگ کر ادھر آئے گا تو
 حضور کے لیے اُس کو واپس کر دینا ضروری ہوگا۔ اس بنا پر اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے مسلمانوں
 کو ناگواری ہوئی لیکن حضور نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور صلحنامہ کی دفعہ متعلقہ کے مطابق
 ابو جندل کو اسی حالت میں مکہ واپس کر دیا۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ معاہدہ میں فریقین کے پڑے کا برابر
 ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا پلڑا کبھی کمزور بھی ہو سکتا ہے اور کبھی بھاری بھی،
 اول کی مثال یہی صلح حدیبیہ ہے جس کا رنج صحابہ کو عموماً اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خصوصاً
 اس درجہ تھا کہ اس تاثر کے ماتحت آپ کی زبان سے چند الفاظ جو بے ساختہ
 نکل گئے تھے اُن کا افسوس عمر بھر رہا۔ اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا ہی یہ واقعہ

بھی قابل ذکر ہے کہ ابورافع ایک قبطنی تھے، قریش نے گفت و شنید کے لیے ان کو بھی بھیجا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو مجھے اسلام کی طرف رغبت محسوس ہوئی اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میں ہرگز قریش کی طرف واپس نہ جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا:

انی لا اخیس بالعہد والا . میں تو نہ عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ قاصد کو قید کرتا
 احبس المبریدا و لکن ارجع ہوں، اس لیے اب تم بہر حال واپس جاؤ پھر جو
 فان كان في نفسك المذی چیز اس وقت تمہارے دل میں ہے وہ اگر لوٹنے
 في نفسك الان فارجع۔ کے بعد بھی ہو تو واپس آجانا۔

اس ارشاد کے مطابق میں واپس چلا گیا اور اس کے بعد جب موقع ملا خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔

اور دوسری صورت کی مثال وہ مصالحت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ کی تھی۔ بہر حال مسلمانوں کی پوزیشن کچھ ہی ہو، قرآن کا حکم یہ ہے کہ جب معاہدہ ہے تو اس کی پابندی مکمل طور پر اور ایمانداری سے ہونی چاہیے۔

وَ اَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ اس کے بارہ میں پوچھ گچھ ہوگی۔
 كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل رکوع ۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام نے ان احکام کی پابندی اس طرح کی کہ امیر معاویہ اور اہل روم کے درمیان ایک معاہدہ تھا جو میعاوی تھا، جب اس معاہدہ کی مدت ختم ہونے کے قریب آئی تو امیر معاویہ ایک لشکر جرار لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوئے کہ معاہدہ کے ختم ہوتے ہی دھاوا بول دیں گے، ابھی یہ لشکر راستہ میں تھا کہ ایک صحابی جن کا نام عمرو بن عبسہ تھا اچانک سامنے کی طرف سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے

اور امیر معاویہ سے بولے: "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جن لوگوں کا کسی قوم سے عہد ہو تو وہ اُس کو اُس وقت تک نسخ نہ کریں جب تک معاہدہ کی مدت نہ گزر جائے یا دونوں اُس کو برابر برابر نسخ کرنے پر رضامند نہ ہو جائیں" راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی امیر معاویہ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس ہو گئے۔

(سنن ابی داؤد کتاب الجہاد حدیث نمبر ۴۱۹ و ترمذی جلد اول)

دشمنانِ جنگجو:

تیسری قسم اُس غیر مسلم ملک یا قوم و قبیلہ کی ہے جو نہ غیر جانبدار ہیں۔ اور نہ اُن سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے دلچسپے آزار دہتے ہیں، اُن کے خلاف سازشیں کرتے اور گھر سے بے گھر کرتے ہیں، یہ لوگ قرآن کی اصطلاح میں "اربابِ اعتداء" ہیں۔ اعتداء و قسم کا ہوتا ہے۔ ایک بالقوة اور دوسرا بالفعل، اگر اعتداء بالقوة ہو یعنی اگرچہ مسلمانوں پر ابھی تک کوئی حملہ نہیں ہوا ہے، لیکن ناقابلِ تردید ذرائع سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو قرآن میں حکم یہ ہے کہ اس کے جواب میں مسلمان بھی غافل نہ رہیں بلکہ پوری مستعدی اور بیدار مغزی کے ساتھ عصری آلاتِ حرب فراہم کرنے کی حسب استطاعت تیاری کریں۔ ارشاد ہے:

اور جیسا کہ وہ اُن سے جنگ کرنے کے لیے وہ

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ

سب کچھ طاقت اور گھوڑے جو تمہارے امکان

مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ

میں ہو، تاکہ تم ان کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے

تُرْهِبُونَهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَ

دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔

عَدَاؤِكُمْ۔ (الانفال ۶۰)

یہی وہ دشمن ہیں جن کی نسبت ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسے پسند

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَلْوَتْغُلُونَ

کرتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور ساز و

عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِكُمْ

سامان سے غافل ہو تو یہ لوگ تم پر اچانک

يَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَيْلَةً

وَاحِدًا - (النساء ۱۰۲)

جملہ کر دیں -

اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ہے جس میں ارشاد ہوا :

بے شبہ ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف قائم کریں اور ہم نے لوہا اتارا ہے جس میں سخت رعب داب ہے۔ اور لوگوں کے لیے منافع ہیں -

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ
بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ
فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ
لِلنَّاسِ - (الحديد ۲۰)

یہ سب کچھ اعتدال بالقوة کے سلسلہ میں تھا! اب رہی اعتدال کی دوسری قسم بالفعل یعنی مسلمانوں پر سچ مچ دھاوا بول دیا گیا، اور ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا ہے تو اب قرآن کا حکم یہ ہے کہ تم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو، اور ان کو شکست دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو، یہی وہ دشمنانِ جنگجو ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے :

جن لوگوں نے (اے مسلمانو!) تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تم کو گھروں سے نکالنے پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی ہے اللہ تم کو ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔ اور جو ان کے ساتھ دوستی کرے گا دراصل ظالم وہی ہوگا۔

إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ
الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ
وَآخَرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ
وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ
أَنْ تَوَلَّوْهُمْ جُجْ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ -
(الممتحنہ ۹)

اسلام اور مسلمانوں کے پی وہ دشمن اور حریفانِ نافرجام ہیں جن سے جنگ کرنے پر قرآن کی متعدد آیات میں مسلمانوں کو براہِ نیگمختہ کیا گیا ہے : ایک آیت میں فرمایا گیا :

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا - (نساء - رکوع ۱۰)

اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کے لیے اور ان کمزوروں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس آبادی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں۔

علاوہ ازیں قوم شمویل سے نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا :

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا - (بقرہ - رکوع ۳۲)

ان لوگوں نے (اپنے نبی سے کہا) ”ہم خدا کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اولادوں سے جدا کیے گئے ہیں۔“

حرب و قتال کے سلسلہ میں یہ وہ آیات ہیں جو محرکات و بواعث جنگ کو متعین کرتی ہیں، ان سب کا خلاصہ اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے :

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ - (النساء آیت ۷۶)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ شیطان کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں۔

یہ اللہ کا راستہ (سبیل اللہ) کیا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا۔ یہ نیکی اور احسان ضعیفوں اور کمزوروں کی مدد، دفع شر، دفع جور و ظلم، استیصال فتنہ و فساد، اور اقامت امن و امان کی راہ ہے۔ اب جنگ چھڑ جائے تو حکم ہے کہ مسلمان بہادری کی طرح لڑیں اور اس وقت تک نچلے نہ بیٹھیں جب تک شر و فساد کے پھٹو کا ڈنک نہ مارا جائے، اس سلسلہ میں اس نوع کی آیات ہیں :

(۱) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ
فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ
لِلَّهِ - (الانفال - سہ کو ع ۵)

اور تم ان لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کرو
جب تک کہ فتنہ ختم اور دین کل کا کل اللہ کے
لیے نہ ہو جائے۔

(۲) إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي
الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ -
(الانفال - سہ کو ع ۱۰)

اگر تم ایسا (یعنی جنگ) نہیں کرو گے تو
زمین میں فتنہ اور عظیم فساد
ہوگا!

سطور بالا میں جو آیات نقل کی گئی ہیں اُن کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ایک ملک کے
دوسرے ملک کے ساتھ اور ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ
تین قسم کے ہی ہوتے ہیں :

(الف) غیر جانبداری اور نا طرفداری (neutrality) کے قرآن نے اس کو "اعتزال"
کہا ہے۔

(ب) عہد و پیمان اور مصالحت و موادعت (Treaty or alliance) کے۔
(ج) حرب و ضرب اور بغض و عداوت (War, Hostility) کے۔

یہ تینوں حالتیں اور تعلقات کی یہ نوعیتیں مستقل بالذات ہیں، ایک دوسرے کے
تابع اور اُس کی قسم نہیں، پس اب لامحالہ اقوام غیر کے دار بھی تین قسم کے ہوں گے اور
یہ تینوں مستقل بالذات ہوں گے، اور ان کی ترتیب یہ ہوگی :

(الف) دارالامن (ب) دارالعہد (ج) دارالحرب - اب اگر مسلمانوں
کے ملک کو جسے دارالاسلام کہا جاتا ہے شامل کر لیا جائے تو دوسری قسمیں دو یا تین
نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اس بحث کے شروع میں بتا چکے ہیں، چار ہوں گی۔

لہ افسوس ہے ہمارے مفسرین کرام کے ایک طبقہ نے ان آیات کو باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دیا
ہے اور اس بنا پر ان کو ان میں نسخ کا قائل ہونا پڑا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ آیات قتال آیات صلح و موادعت
کے لیے ناسخ ہیں۔ انہیں مفسرین کے زیر اثر وہ فقہائے کرام ہیں جو اصل دوسری قسم کے ہی (بقیہ صفحہ ۷۸)

دارالحرب میں سکونت جائز نہیں :

علاوہ ازیں اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب دارالحرب کہتے ہی اُس ملک کو ہیں جس کی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہو، مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرتی ہو اور اس بنا پر نہ دونوں میں جنگ بالفعل ہو یا جنگ کے سے حالات قائم ہوں تو اب مسلمانوں کے لیے اس ملک میں سکونت رکھنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جیسا مولانا نانوتوی نے لکھا ہے (حوالہ گزر چکا) وہاں سے ہجرت واجب ہوگی، چنانچہ قرآن مجید کی آیت ذیل ایسے ہی مسلمانوں کے بارہ میں ہے جو دارالحرب سے ہجرت نہیں کرتے :

إِنَّ الَّذِينَ تَوَقَّعُوا الْمَلَائِكَةَ
ظَالِمِينَ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ
كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ
فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ
أَرْضَ اللَّهِ أَسِعَةً فَهَاجِرُوا
فِيهَا فَأُولَئِكَ مَا لَهُمْ
بِجَهَنَّمَ وَلَا سَاءَتْ مَصِيرًا ۝
(النساء - ۷۶ کو ۱۲۶)

جن لوگوں نے ہجرت نہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے جب ان کو موت آئے گی تو فرشتے ان سے کہیں گے ”تمہیں کیا ہو گیا تھا“ (جو ہجرت نہیں کی تھی) یہ کہیں گے، ”ہم ملک میں کمزور تھے“ اب فرشتے کہیں گے ”کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی جو تم اُس میں ہجرت کرتے؟ پس یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔“

ہجرت کے وجوب حکم سے اگر مستثنیٰ ہیں تو صرف وہ لوگ جو بے کس و بے بس ہیں اور نقل مکانی کی استطاعت ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا گیا :

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ
الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانَ
مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ جَاهٌ وَلَا
مَالٌ وَلَا حِرْمٌ وَلَا
وَلَدٌ وَلَا عِيَالٌ وَلَا
مَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ جَاهٌ وَلَا
مَالٌ وَلَا حِرْمٌ وَلَا
وَلَدٌ وَلَا عِيَالٌ وَلَا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دو قسم کے ہی مانتے ہیں، دارالاسلام اور دارالحرب اور پھر امن و امان یا عہد و پیمان کی کوئی صورت پیش آجاتی ہے تو اس کو دارالحرب کی ہی ایک قسم قرار دے دیتے ہیں لیکن ہم نے جو تقریر کی ہے اس کی روشنی میں تمام آیات اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہیں وراحمکام میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہی ان آیات کا منشا ہے۔

لَا يَنْتَظِعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ
سَبِيلًا ۝ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ
أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ
عَفُورًا غَفُورًا ۝ (النساء، رکوع ۱۰)

راستہ ہی نہیں ملتا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا
ممكن ہے انھیں معاف کر دے، اور اللہ
بڑا معاف کرنے والا، اور بخشنے والا
ہے۔

ایک لطیفہ :

مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیتہ علمائے ہند جو دار الحرب سے ہجرت کو واجب قرار
نہیں دیتے انھوں نے ایک عجب کمال کیا ہے۔ قرآن میں ایک آیت ہے جس میں
دار الحرب سے ہجرت نہ کرنے والوں کے خلاف اظہارِ بیزاری و ناراضگی کیا گیا اور بطور
غفگی کے دارالاسلام کے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اچھا! اگر یہ لوگ ہجرت نہیں
کرتے تو نہ کریں، یہ جانیں اور ان کا کام! اب اگر (دار الحرب میں رہنے کے باعث)
ان کو کچھ نقصان بھی پہنچے تو اسے دارالاسلام کے مسلمانوں! تم پر اس کی کوئی ذمہ داری
نہیں ہے؛ مولانا نے اس سے عدم وجوبِ ہجرت پر استدلال کیا ہے۔ ذرا غور
کیجیے تو یہ استدلال صحیح ایسا ہی ہے جیسے ”لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ“ اور
فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ سے یہ ثابت کرنا کہ قرآن دین
کے معاملہ میں، ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔

بہر حال قرآن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے دار الحرب
میں سکونت اختیار کرنا حرام ہے، اور جو ایسا نہیں کرتے ان کے لیے جہنم کی وعید
شدید ہے۔ البتہ اس کے علاوہ جو اور دو دامن ہیں :- یعنی دارالامان اور دارالعہد ان
میں رہنا بسنا اور توطن جائز ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ :

یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے، اُس کا دفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اشکال یہ ہے کہ

لَهُ وَهُوَ آيَةٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا لَمَّا جُرُوا ۖ مَا لَكُمْ مِنْ وَلَا يَتَّهِمُونَ شَيْئًا حَقًّا

يُهَاجِرُوا ۖ (الانفال، رکوع ۱۰) لہ روزنامہ الجمعیتہ دہلی مورخہ ۷ مئی ۱۹۶۶ء صفحہ ۴۶ کا م ۲-۱

جب قرآن سے چار قسم کے دامن ثابت ہوتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ کتب فقہ میں عام طور پر دارالاسلام اور دارالحرب صرف ان ہی دو داروں کا ذکر ملتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ مشہور یہ دو دار ہی ہیں لیکن امام شافعی اور امام محمد بن الحسن ایک تیسرا دار بھی مانتے تھے، چنانچہ السیر البکیر میں امام محمد نے اس کا تذکرہ کر کے اسے ازموادعت بھی کہا ہے اور دارالعہد بھی، شیخ ابو زہرہ اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”ہمارے لیے یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ دارالعہد دارحرب نہیں

ہوتا۔ اور اگرچہ اس پر بعض احکام دارالاسلام کے بھی جاری ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک مستقل بالذات دار ہوتا ہے۔“

لیکن یہ جواب رفع اشکال کے لیے کافی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے، جیسا کہ شیخ

محمد ابو زہرہ نے لکھا ہے:

”جو زمانہ اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترتیب کا تھا اُس میں صورتِ حال یہ تھی کہ عملاً تین قسم کے ہی دار تھے۔ ایک دارالاسلام، دوسرا دارالحرب اور تیسرا دارالعہد، چوتھا دار یعنی اُن لوگوں کا ملک جو نا طرفدار اور غیر جانب دار ہوں وہ ناپید تھا۔

اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں جو غیر مسلم حکومتیں مسلمانوں کے اطراف و اکناف میں تھیں، ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث مسلمان اُن کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے اس بنا پر مسلمان ان حکومتوں سے مطالبہ کرتے

تھے کہ وہ اس کے ساتھ عہد و پیمان امن کریں، اور اگر انھیں یہ منظور نہیں ہے تو اب اُن کے لیے اسلام یا جنگ، یہ صرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔“

یہی بات عہدِ حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ عبدالقادر عودہ نے کہی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

۱۔ مقالہ ”العلاقات الدولیة فی الاسلام مطبوعہ الازہر بابت مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲۸۰۔

۲۔ ایضاً ص ۲۷۶۔

”اسلامی نظریات جو تمام بلادِ اجنبیہ کو ایک دارِ حرب قرار دیتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی حکومتیں مختلف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان، ترکستان، روس، ہند۔ اسپین۔ فرانس اور روم ان سب ملکوں کی حکومتوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس بنا پر وہ ان سب ملکوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی دارِ حرب کہنے لگے۔“

اس بنا پر ہمارے علماء کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عہدِ نبیِ عباس کے اوائل میں فقہائے کرام نے دار کی جو تقسیم کی اور اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اُس زمانہ کے مخصوص وقتی اور مقامی حالات کا نتیجہ ہے جب کہ جنگ کی بنیادی وجہ مذہب ہوتا تھا اور اسی بنیاد پر مسلمان ایک عالمگیر جنگ سے دوچار تھے۔ یہ حالات کا دباؤ کس قدر شدید ہوتا اور فکر و نظر کے سانچے اور پیمانے کس طرح بدل دیتا ہے؟ اس کی ایک دل چسپ مثال ملاحظہ فرمائیے :

حالات کے دباؤ کی ایک عجیب مثال :

صلح حدیبیہ کے ذکر کے سلسلہ میں آپ اوپر ابورافع قبضی کا واقعہ پڑھ آئے ہیں کہ یہ قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے، لیکن حضور انورؐ کو دیکھتے ہی انہوں نے اسلام کو قبول کرنا چاہا، اور عرض کیا کہ اب میں قریش کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ لیکن حضورؐ نے ان کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ انہیں واپس کر دیا اور فرمایا ”میں نہ بدعہدی کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو جس کرتا ہوں“ اس واقعہ کو اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں وفاتے عہد کے جو احکام بڑی تاکید کے ساتھ ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر سوچئے کہ اس طرح کا معاملہ جب کبھی پیش آئے تو اس وقت اسلامی حکومت کا عمل کیا ہونا چاہیے؟ حضورؐ چونکہ ہر معاملہ میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اس بنا پر یقیناً اسلامی حکومت کو وہی کرنا چاہیے جو اس واقعہ میں آپؐ نے کیا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ امام ابو داؤد اپنی سنن میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

هذا كان في ذلك الزمان واليوم لا يصلح
 اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ اسے شارح سنن ابی داؤد کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

والله اذ بهذا الكلام ان
 من جاء من الكفار الى
 الامام رسولا فاسلم واما
 ان لا يرجع الى الكفار لا
 يرد الامام اليهم واما
 ان رسول الله صلى الله عليه
 وسلم لم يجس ابا رافع وهو
 من المخصوص به صلى الله
 عليه وسلم

اور اس کلام سے مراد یہ ہے کہ کفار کی
 طرف سے اگر کوئی شخص امام کے پاس سفیر
 بن کر آئے اور مسلمان ہو جائے اور واپس نہ
 جانے کا ارادہ کرے تو امام اس کو واپس
 نہ کرے۔ اب یہی بات کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کو نہیں روکا
 تھا تو یہ ان چیزوں میں سے ہے جو
 آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
 مخصوص ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ جیسا کہ میں نے مکمل یونیورسٹی میں ایک لکچر میں کہا تھا۔ تاریخ مذاہب
 عالم کا یہ بڑا دروانگیر سانحہ ہے کہ مذہب جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ماننے والوں
 کو ایک خاص تربیت دے کر ایک سوسائٹی پیدا کرتا ہے، یہ سوسائٹی ایک تاریخ
 پیدا کرتی ہے، لیکن دو تین نسلوں کے بعد تاریخ مذہب کی جگہ لے لیتی ہے اور نتیجہ
 یہ ہوتا ہے کہ مذہب اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر انداز ہو جاتا ہے اور پھر جتنے
 فیصلے ہوتے ہیں، وہ سب تاریخ کی روشنی میں ہوتے ہیں، چنانچہ اسلام کے ساتھ بھی
 معاملہ یہی پیش آیا۔ علم الکلام، فقہ، تصوف، اور تاویل یہ وہ چیزیں ہیں جن کو تاریخ نے
 پیدا کیا ہے لیکن یہ ہی چیزیں ہمارے منکر و نظر کا معیار بن گئی ہیں، اور قرآن و سنت جو
 مذہب کے اصل سرچشمے ہیں ان کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے: یعنی اگر آپ مثلاً حنفی ہیں
 تو وہی کہیں گے جو فقہائے احناف نے کہا ہے اور پھر قرآن و سنت سے اس کے

۱۔ بذل الجہود، جلد ۴، ص ۵۶، مطبوعہ جمیعہ برقی پریس (دہلی)

یہ ثبوت فراہم کریں گے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے آپ براہِ راست منجلی باطبع ہو کر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کریں اور اس کے بعد فقہاء کے اقوال کا جائزہ لیں۔ بہر حال اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ داس از روئے قرآن دو یا تین نہیں بلکہ چار ہیں اور ہر دار کسی کی قسم نہیں بلکہ مستقل بالذات ہے اور ان کے احکام الگ الگ ہیں تو اب موقع ہے کہ اصل سوال کا جواب دیا جائے۔ یعنی یہ کہ اچھا! جب ہندوستان دارالحدیث نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہندوستان جس طرح دارالحدیث نہیں ہے۔ دارالاسلام بھی نہیں ہے اور دارالعہد اور دارالامن بھی نہیں ہے۔ کیوں؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جب ہم ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس ملک کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے اور دوسرے خود اس ملک کے مسلمانوں کے لیے، جہاں تک امر اول کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے ”دارالعہد“ کی ہے، پھر یہ عہد اور مختلف معاملات و مسائل میں اشتراک و تعاون جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر ایک مسلمان ملک کا تعلق ہندوستان کے ساتھ زیادہ ہوگا۔ مثلاً ایک ملک کے ساتھ وہ برطانوی کامن ولتھ میں بھی شریک ہے اور مجلس اقوام متحدہ میں بھی! اور ایک ملک کے ساتھ یہ دونوں رشتے بھی ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اور تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی علائق و روابط بھی ہیں، ظاہر ہے ان دونوں قسم کے ملکوں کے ساتھ ”دارالعہد“ ہونے کا رشتہ ایک ہی درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہو سکتا، بہر حال جس مسلمان ملک کے لیے ہندوستان جس درجہ کا دارالعہد ہے اُس ملک کی حکومت کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اُس کا احترام کرے اور عہد و پیمان کے جملہ شرائط کو صورتاً و معنی پورا کرے!

اے فقہ کی کتابوں میں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ملک کسی مسلمان ملک کے ساتھ روپیہ میں دس آنہ احسان و کرم اور لطف و مدارات کا معاملہ کرے تو مسلمان ملک کا فرض ہے کہ اس کے جواب میں وہ غیر مسلم (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

اب رہا خود ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ! تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ ملک دار کی چاروں قسموں میں سے کوئی قسم نہیں ہے۔ دار الحرب نہ ہونے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے، رہے باقی تین دار! تو اس کا دار الاسلام نہ ہونا ایسا ظاہر ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک کی حکومت ہی سیکولر اور لادینی ہو اُس کے دار الاسلام ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے! اگرچہ ہمارے جن علمائے انگریزوں کے زمانہ کے ہندوستان کو — انگریزی حکومت کے سیکولر ہونے کے باوجود — دار الاسلام کہا ہے۔ وہ موجود آزاد ہندوستان کو بدرجہ اولیٰ دار الاسلام کہیں گے۔ لیکن ہم ابھی آگے چل کر بتائیں گے کہ اُن کا وہ فیصلہ غلط تھا اور یہ بھی غلط ہوگا۔ کیوں کہ درحقیقت ان حضرات کا تصور دار الحرب و دار الاسلام ہی صحیح نہیں۔

جس طرح ہندوستان دار الحرب اور دار الاسلام نہیں ہے۔ اسی طرح دار العہد اور دار الامان بھی نہیں۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں دار وہاں پائے جاتے ہیں جہاں مسلمان ایک فریق ہوں اور غیر مسلم فریق ثانی ہوں۔ اور ان دونوں میں علی الترتیب معاہدہ اور امن و متامن ہونے کا رشتہ اور تعلق پایا جائے۔ اور ظاہر ہے یہاں یہ رشتہ مفقود ہے۔ کیونکہ دستوری طور پر اور قومیت (nationality) کے موجودہ بین الاقوامی تصور کے ماتحت اس ملک کے مسلم اور غیر مسلم سب مل کر ایک قوم ہیں۔ اور حکومت جو ہے وہ اسی قوم کی ہے۔ اور یہ قوم ایک دستوری پابند ہے۔ جس کو عملی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملک کے ساتھ روپیہ میں ۱۲ یا ۱۴ معاملہ حسن اخلاق کا کرے۔ اور فقہا اس کی دلیل میں فرماتے ہیں: "لاننا احق بالماکار من الاحلاق" یعنی بحیثیت مسلمان کے ہم کو اور زیادہ بہتر مکارم و اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اگر بالفرض ایک مسلمان بھی نہ ہوتا تو یہ ملک مسلم ممالک کے لیے انٹرنیشنل ڈپلومیٹک اصول و ضوابط کے ماتحت پھر بھی دار العہد ہوتا۔ لیکن جب کہ یہاں پانچ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان بھی آباد ہیں، اور ان کی عظیم الشان روایات اور تاریخ ہیں تو اب مسلم ملکوں کے لیے اس ملک کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کا برتاؤ کرنے کا ایک مزید وجہ وجیہ موجود ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی دونوں سے بچتی ہے۔

شکل دینا اور اُس کی حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ دستور نے دیے ہیں نہ کہ اکثریت نے اور انھیں جو کچھ شکایت کسی معاملہ میں بھی ہو حکومت سے ہی ہو سکتی ہے جس کی تشکیل میں خود مسلمانوں کا ایسا ہی حصہ ہے جیسا دوسروں کا۔ کہ وہ دستور کی حفاظت اور دوسرے لفظوں میں ان کی نمایندگی اور اعتماد کا حق ادا نہیں کر رہی ہے، بہر حال ان وجوہ سے ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کے لیے دارالعباد اور دارالامن بھی نہیں ہے۔

اب پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو آخر یہ ہے کیا؟ اور شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی طبقات کے باہمی تعلق اور بین الاقوامی علاقوں و روابط جس بیج اور جس ڈھنگ پر ہوتے تھے، آج صورت حال اُس سے بالکل مختلف ہے اس بنا پر پہلے قوموں کی جو تقسیم ہوتی اور اس پر جو احکام و مسائل مرتب ہوتے تھے آج اُن کا اطلاق اُن قدیم مفاسم و معانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، باب الرقیق اور باب العتق فقہ کے بہت اہم ابواب تھے۔ لیکن آج یہ بالکل بے کار ہیں۔ کتاب الحدود کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن آج کہاں اس پر عمل ہو رہا ہے؟ فقہ میں ”ذمی“ اور ”ذمیہ“ کے احکام و مسائل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن آج ذمی کا وجود کس ملک میں ہے؟ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کون سی تبدیلی صحیح ہے اور کونسی غلط؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ تبدیلی سے یا نہیں؟ پس جب تبدیلی ہے تو لازمی طور پر اس کا اثر احکام و مسائل پر پڑے گا۔ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ تبدیل مذہب سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ بلا عام ہو گئی تو مولانا تھانویؒ نے علماء کے مشورہ اور ان کے اتفاق سے فتویٰ اس کے برعکس دیا اور اس پر الحیلۃ الناجزۃ للمرأة العاجزۃ کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا۔ تعلیم قرآن و امامت کی اجرت کو فقہائے متقدمین نے ناجائز کہا ہے۔ لیکن متاخرین نے اسے سند جواز عطا فرمادی۔ حلقہ لجمیہ کو فقہائے متقدمین نے علامت فسق اور اُس کے ترکیب کو مردود الشہادۃ قرار دیا۔ لیکن آج ان لوگوں کی نہ صرف یہ کہ شہادت

مردود ہیں ہے۔ بلکہ اسلامی ممالک میں امامت۔ درس قرآن و حدیث اور عہدہ قضا و افتا کی کرسیوں پر متمکن ہیں۔ جن درختوں کے پھل ابھی پکے نہیں اور ان کی مقدار معلوم و معین نہیں ہے، فرمانِ نبویؐ کے مطابق ان کی بیج حلال نہیں تھی، لیکن آج ہر جگہ یہ کاروبار ہو رہا ہے اور بڑے بڑے زمین دار علماء کہہ رہے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں ہے۔ تصویر کھنچوانا اور رکھنا دونوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن آج حجاز مقدس میں بھی اس کا عام چلن اور رواج ہے۔ فقہا اس بات میں اختلاف کرتے رہے کہ عورت کا چہرہ اور اس کے دونوں ہاتھ بھی ستر میں داخل ہیں یا نہیں۔ لیکن عورت نے پردہ کے پیچھے سے وہ جست لگائی کہ جھٹ ہر شعبہ حیات میں مرد کی شریک و سہم نہیں، بلکہ رقیب بن گئی۔ اور اسلامی سماج نے اس کو اس خموشی سے قبول کر لیا ہے کہ دخترانِ اسلام گرمی کے موسم میں سمندروں کے کنارے غسلِ آفتابی لیتی ہیں اور کہیں پتہ بھی نہیں کھڑکتا یہ سب کچھ کیا ہے؟ اچھا یا بُرا ماحول کا انقلاب ہے، جس نے اسلام کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی قدروں کو اٹھل پھل کر دیا اور انہیں کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ ان میں کتنی چیزیں ہیں جو پہلے ناجائز تھیں اور اب انہیں فتویٰ کے سہارے جائز کر دیا گیا ہے، اور کتنی ہی وہ ہیں جو پہلے کی طرح ناجائز یا حرام اب بھی ہیں، لیکن ان سے متعلق بھی حالات کا یہ اثر ضرور ہوا ہے کہ پہلے یہ بالکل ناگوار تھیں اب گوارا ہو گئی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے گوارا ہو جانے کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب وقت کا مجدد اور مفتی انہیں بھی سندِ جواز عطا فرما کر محملات میں شامل کر لے گا اور دنیا سے دیکھ کر شیخ سعدی کے مقولہ ”زمانہ باتو نسا زد تو با زمانہ بساز“ کی حکمت و مصلحت پر مہر تصدیق ثبت کرنے پر مجبور ہوگی۔

بین الاقوامی تصویر قومیت :

بہر حال جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ اسلام میں شخصی یا خاندانی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس پر عمل صرف خلافتِ راشدہ کے زمانہ تک رہا۔ اس کے بعد حکومتِ خلافت یا امامت سے ملوکیت کی شکل و صورت میں منتقل اور خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ جس کا موقع لگا بادشاہ بن کر بیٹھ

گیا اور جب اُس کا انتقال ہوا تو تختِ شاہی بطور ایک ترکہ کے اُس کی آل اولاد یا بھائی بھتیجوں کے حصہ میں آگیا۔ اس دور میں شاہی خاندان کے علاوہ حدودِ مملکت میں رہنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے رعیت یا رعایا (subject) کہلاتے تھے۔ لیکن خود رعیت دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی، ایک وہ لوگ جو حکمرانوں کے ہم مذہب ہوتے تھے اور دوسرے وہ جو ان کے ہم مذہب نہیں ہوتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ملک کے شہری (citizens) ہوتے تھے۔ لیکن بنیادی حقوق میں یکساں شریک ہونے کے باوجود ان دونوں میں بعض اعتبارات سے فرق امتیاز ہوتا تھا۔ مسلمان حکومتوں میں یہی فرق ”ذمی“ کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ریاستھائے متحدہ امریکہ میں وہاں کے دستور میں انیسویں ترمیم سے پہلے عورتوں کو تمام حقوق شہریت حاصل تھے۔ لیکن ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ یا آج بھی امریکہ کے جو پیدائشی باشندے ہیں اور جو وہاں آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگ پریزیڈنٹ یا وائس پریزیڈنٹ نہیں ہو سکتے۔ حکومت ایک قسم کی مذہبی ہوتی یا سمجھی جاتی تھی۔ اس بنا پر اس مذہب کے لوگوں کو یک گونہ فوقیت ہوتی تھی۔ تمام دنیا میں یہی طریقہ رائج تھا!

لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ رعایا (subject) کی جگہ شہریت (citizenship) اور قومیت یا جنسیت (nationality) نے لے لی ہے اور حکومت کے تصور کے ساتھ ساتھ باشندگانِ ملک کی جنسیت کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ پہلے حکومت چند افراد یا خاندان کی ہوتی تھی، اس بنا پر حکمران آقا اور باشندگانِ ملک رعایا سمجھے جاتے تھے، لیکن آج حکومت عوام کی نمائندہ اور ان کی منتخب ہوتی ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں جو جاگیردارانہ نظام سلطنت (feudal system of government) رائج

تھا) اب اس کے بجائے علاقائی خود مختاری (territorial state sovereignty) کا رواج ہے اور جسے ہم اسٹیٹ کہتے ہیں وہ سب اہل ملک کا ایک کارپوریشن (corporation of member individuals) ہے، یورپ

کا یہ تصور اسٹیٹ اور اس کے نتیجے میں شہریت اور قومیت کا یہ تصور اب عالمگیر اور بین الاقوامی ہے جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے تسلیم کر لیا ہے۔ اور پاسپورٹ اور وزا اور شہریت و قومیت سے متعلق تمام بین الاقوامی مسائل و معاملات کا انتظام و انصرام اسی پر ہے۔

دارالاسلام کی تعریف :

شہریت - قومیت اور اسٹیٹ ان جدید مسلمہ بین الاقوامی تصورات کو ذہن میں رکھ کر اب اس پر غور کیجیے کہ آج صحیح معنی میں دارالاسلام کس ملک کو کہا جاسکتا ہے؟ فقہا کی تصریح کے مطابق دارالاسلام میں تین شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) صدر مملکت جسے فقہا عام طور پر امام کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اُس کو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے ناموس شریعت کا محافظ اور پاسبان ہونا چاہیے۔

(۲) ملک میں اسلامی قانون رائج ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد عدل اور احسان کا قیام اور فواحش و منکرات کا استیصال ہے۔

(۳) ہر مسلمان خواہ کسی ملک اور علاقہ کا باشندہ ہو اور اس اعتبار سے ایک مقامی قومیت رکھتا ہو، اُس کو دارالاسلام میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت ہوگی اور اسے وہاں پہنچتے ہی وہ تمام شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے جو وہاں کے پہلے سے رہنے والوں کو حاصل ہیں، وہ وہاں زمین خرید سکتا ہے۔ کھیتی باڑی اور کاروبار کر سکتا ہے۔ ملازمت میں لیا جاسکتا اور جاگیر جائیداد پیدا کر سکتا ہے اسے اختیار ہے جب تک چاہے وہاں قیام کرے۔ حکومت اُس کو اخراج کا حکم نہیں دے سکتی، اسی بنا پر یہ مسلمان اگر کسی دوسرے ملک میں کسی دوسرے ملک میں کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہے تو دارالاسلام کی حکومت کو حق ہوگا کہ وہ اسے سزا دے۔

دارالاسلام کے ان شرائط سے گانہ کو جو تقویٰ میں نہ کہ تقسیم، پیش نظر رکھ کر سوچیے کہ دارالاسلام کی یہ تعریف آج کسی ملک پر صادق آتی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ایک موقع پر کہا تھا۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر آپ نے یہ کوئی اصطلاح ہی بنالی ہے کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے آپ اسے دارالاسلام کہیں گے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ سچی بات

تو یہ ہے کہ جس ملک میں فواحش و منکرات عام ہوں اور ملک کا قانون اُن کا انسداد نہ کرتا ہو اُس کو دارالاسلام کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شاندار محل ہو جس میں برہمنہ عورتوں کے عجیبے جا بجا نصب ہوں۔ اور اُس کے پر تکلف آراستہ و پیراستہ کمروں میں کہیں طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہو، کہیں گھنگروں بج رہے ہوں اور کہیں ”ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں“ کا ہنگامہ برہم پاپ ہو اور ان تمام خصوصیات کے باوجود آپ فرمائیں کہ یہ قصر رفیع الشان ”شیخ حرم“ کی رہائش گاہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ لا مشاحۃ فی الاصطلاح کی آڑ لے کر آپ تسمیۃ الشئ باسم غیرہ کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ علاوہ ازیں آج پاسپورٹ اور وزا کے جو قواعد و ضوابط ہیں اُن کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جو مسلمان مجازہ مقدس جاتے ہیں، ان کو وزا میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ وہاں کوئی کاروبار یا ملازمت نہ کریں گے۔ اور وہاں بھی شہری حقوق حاصل کرنے کے وہی قواعد و ضوابط ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہیں، ان امور کے پیش نظر دو حال سے خالی نہیں، اگر دارالاسلام کی تعریف اور اُس کے خصوصیات اب بھی وہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں اور جن کی وجہ سے اسم اور مسمی میں مطابقت پیدا ہوتی ہے تو پھر بتانا ہوگا کہ ان اوصاف و خصائص کا حامل کونسا ملک ہے اور یا دارالاسلام کی کوئی نئی تعریف ایسی کرنی ہوگی جس کے ماتحت مسلمانوں کی اکثریت والے ملک دارالاسلام کہلا سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ابھی ہوا۔ مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک جہاں مسلمان صدر مملکت ہے فقہاء کے اُن بیانات کی روشنی میں جنہیں ہم سابق میں نقل کر آئے ہیں دارالاسلام ہی ہیں، لیکن ان ممالک کی کیا خصوصیت ہے۔ ان بیانات کی رُو سے تو ہندوستان اور دوسرے غیر مسلم اکثریت برطانوی عہد کے ہندوستان کو کس کثرت سے علماء نے دارالاسلام لکھا اور کہا، ہی ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دارالاسلام اور دارالہرب کی اصطلاح کہیں قرآن میں نہیں ہے اور عہد نبوت و عہد صحابہ میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا، پھر قدیم مصنفین کی کتابوں میں عام طور پر بجائے دارالاسلام کے ”داسرنا“ ”ہمارا ملک“ یا ”ہمارا وطن“

کے الفاظ ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتب فقہ میں دارالاسلام کے ساتھ ”دارالمسلمین“ کا لفظ بھی مستعمل ہوا ہے۔ اور اس زمانہ میں بدقسمتی سے کوئی ملک ایسا نظر بھی نہیں آتا جس پر اسلام فخر کر سکے اور جو فقہاء کے بیانات سے قطع نظر (صورتاً و معنی) دارالاسلام ہو اس بنا پر ہمارے زمانہ میں شہریت اور قومیت یا جنسیت کا جو بین الاقوامی تصور قائم ہو گیا ہے اور جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے اختیار کر لیا ہے، ہم کیوں نہ اُس کی روشنی میں داس کی ایک نئی قسم معین کریں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ ورنہ اس مقالہ کا اصل موضوع بحث ہندوستان ہے، اور اسی سے ہمیں سروکار ہے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ سب ہندوستانی مذہب اور زبان اور رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود ستوری اور آئینی طور پر ایک قوم (nation) ہیں اور مسلمان بھی اس کا ایک جز ہیں، چنانچہ پاسپورٹ - ویزا - شہری حقوق - قومی اور بین الاقوامی معاملات و مسائل - ان سب امور میں ان کے ساتھ جو معاملہ یا برتاؤ ہوتا ہے وہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے، ان کی یہ وہ حیثیت ہے جس کو خود انھوں نے تسلیم کیا ہے، اور انٹرنیشنل لا کے ماتحت دنیا کی سب مسلم اور غیر مسلم حکومتوں اور قوموں نے کیا ہے۔ اس بنا پر ہندوستان کسی ایک مذہب یا گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا وطن (داس) ہے جو انڈین نیشنلٹی رکھتے اور انڈین نیشن کا جز ہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان سے یا ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے جو تعلق یا رابطہ (association) ہوتا ہے وہ بہت سے دائروں میں تقسیم ہے اس سلسلہ کا سب سے بڑا دائرہ وہ ہے جس میں ربط بر بنائے انسانیت ہوتا ہے۔ اس کے بعد مذہب اور پھر وطن کے دائرے ہیں کسی دائرہ کے بڑے ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ اُس سے چھوٹے دائروں سے زیادہ اہم ہے۔ البتہ ہر دائرہ کے حدود اور اُس کے اپنے

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جدید ایڈیشن جلد ۲ ص ۱۲۷۔

۲۔ ملاحظہ کیجیے المبسوط للسخی ج ۱۰ ص ۱۱۲ باب المرتدین۔

مقتضیات و مطالبات ہیں، بہر حال انسانی علائق و روابط کے یہ دائرے طبعی اور فطری ہیں، اس بنا پر اسلام بھی انھیں تسلیم کرتا اور ان کے حدودِ اربعہ متعین کر کے ہر ایک کے واجبات و مطالبات کی تشخیص کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبروں نے جگہ جگہ اپنے اہل وطن کو یا قومنا۔ یا یا قومی، کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کے لیے جن میں آپ مبعوث ہوئے قوم کہا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن میں امة کا لفظ بھی قوم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمِنْ اُمَّةٍ الْاِخْلَافِہِ نَذِیْرٌ اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بھی مسلمانوں اور یہود سب کو امة واحداة فرمایا، پس جب اس وطنی اشتراک کو قرآن تسلیم کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے تسلیم کیا اور اس کی اساس پر آپ نے غیر مسلموں سے معاملات طے کیے اور ان لوگوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا اس بنا پر ہندوستان کی شرعی حیثیت یہاں کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ یہ ان کا الوطن القومی (national home) ہے اور اس کے لیے جداگانہ احکام ہیں یوں تو اسلام کی تعلیمات کی رو سے دنیا کے سب انسانوں کے ساتھ ہی بر وقسط اور احسان و کرم اور خد و اعانت کا معاملہ ہونا چاہیے۔ لیکن الاقرب فالاقرب کے ماتحت جو جتنا قریب ہے اتنا ہی اس کا حق ہے، اسی بنا پر قرآن میں ذوی القربیٰ کو دوسرے مستحقین امداد و اعانت پر مقدم رکھا گیا ہے۔

قومی وطن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو ترقی دینے اور اسے مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور جہاں کہیں ظلم و بے انصافی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائیں اور عدل و احسان کے قیام اور منکر و فحشا سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے ذہن اور دماغ، ان کی صلاحیتِ کار۔ ان کی دولت و ثروت اور ان کے اخلاق و کردار پر صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ اس ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کا حق ہے۔ جس زمانہ میں

مسلمانوں کی طاقت و قوت اور ان کی حکومت و سلطنت کا ڈنکا بچتا تھا اُس زمانہ میں بھی مسلمانوں کا عمل اصولِ فقہ کے اس مشہور اصول پر تھا :

المسلم والكافر في مصائب
الدنيا سواءٍ ۱۰
مسلمان اور غیر مسلم دنیاوی مصائب و حوادث
میں برابر ہیں۔

اسلام میں شرک سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود شرک کے متعلق بھی حکم یہ ہے کہ اگر وہ پناہ مانگے تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اسے پناہ دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ
اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ
اگر کوئی ایک مشرک بھی تجھ سے پناہ طلب
کرے تو اس کو پناہ دے۔

پس جس مذہب کی تعلیمات پر ہوں اُس کے ماننے والوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ برادرانِ وطن اور خود وطن کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔



پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

اور

اس میں غیر مسلموں کا درجہ و مقام

پچھلے دنوں نہرو ریاست معاہدہ کے موقع پر وزیر اعظم پاکستان نے پڈت نہرو سے کہا اور پھر پریس کانفرنس میں بیان دیتے ہوئے بھی انھوں نے اس کی تصریح کی کہ پاکستان ایک عہد نامہ کی جدید قسم کی جمہوریت (modern democratist) ہے اور اس بنا پر اس میں غیر مسلموں کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو وہاں کے مسلمانوں کو ہیں۔ سول اور ملٹری کے تمام محکمے، اسمبلی کی ممبری، ووٹ دینے کا حق، عقیدہ و عمل کی آزادی ان سب چیزوں کے دروازے ان کے لیے اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح وہ مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یاد ہو گا کہ بعینہ یہی بات پاکستان کے مرحوم مؤسس اول نے اس وقت کہی تھی جب کہ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے پہلی تقریر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی بلکہ اپنے مقصد کو زیادہ مؤکد کرنے کے لیے انھوں نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ ”اب پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہوگا اور نہ کوئی مسلمان بلکہ پاکستان کا سر باشندہ بلا تفریق مذہب و ملت صرف پاکستانی ہوگا، اور اس کے ساتھ اسی حیثیت سے معاملہ کیا جائے گا۔“

لیکن پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اپنے بنیادی مقصد کے رزلوشن میں پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دے چکی ہے۔ تو اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ بانی پاکستان اور وزیر اعظم پاکستان کے یہ اعلانات ”اسلامی حکومت“ کے اعلان کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر رکھتے ہیں تو اس چیز کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

صاف اور واضح ہونا چاہیے۔ ورنہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ قسم کی چند پارٹیاں ہیں جن کے نزدیک یہاں ہندو راج یا رام راج قائم ہونا چاہیے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے۔ باقی ان کے علاوہ دوسری قومیں یہاں کی شہری نہیں ہو سکتیں، اسی طرح پاکستان میں کچھ جماعتیں ہیں جن کے خیال میں اسلامی حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ جو غیر مسلم وہاں رہیں گے تو اگرچہ ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہوگا لیکن ان کو وہ تمام شہری حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو مسلمانوں کو ہوں گے اس بناء پر اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ نے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہاں کی اکثریت کے غلط مذہبی تصورات کو آگے کار بنا کر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اب یا الکشن کے موقع پر اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان کی یہ جماعتیں گورنمنٹ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں اور ”اسلامی حکومت“ کے غلط تصور کو پیش کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

علاوہ بریں اس مقالہ کا ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ حالیہ فسادات کے باعث اشتعال پذیر بیہی کے عالم میں چند گستاخ و بدزبان اخبارات و رسائل نے پاکستان کو برا کہتے کہتے اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں بھی حد درجہ مکروہ و ناشایستہ الفاظ استعمال کیے ہیں جہاں تک ان کی بدزبانی اور دریدہ دہنی کا تعلق ہے تو ہم اس کے جواب میں اس سے زیادہ نہیں کہنا چاہتے کہ ایک بھاری اور مقتدر اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہوئے کسی دستِ پاشکستہ اقلیت کے مذہب اور اس کے پیغمبر کی شان میں اس طرح گستاخ زبانی کرنا کینہ پن کی وہ آخری منزل ہے جہاں انسانیت لٹھ کھڑا کر گہ پڑتی ہے اور اگر ہم چاہیں تو جواب تر کی بہ تر کی دے کر اپنے ان حرفیوں کو برسوں انگاروں پر لٹا بھی سکتے ہیں۔

تم کو بھی ہم بتائیں کہ جنوں نے کیا کیا فرصت کشائش غم پنہاں سے گرے

بہر حال جہاں تک اس مشالہ کی وضاحت کا تعلق ہے۔ ہم اسے بیان کرتے ہیں

تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں سمجھ سکیں کہ اگر پاکستان واقعی اسلامی حکومت سے بھی تو اس کے غیر مسلموں کا وہاں کی حکومت میں درجہ و مقام کیا ہے؟ اور وزیر اعظم پاکستان نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس میں اسلامی حکومت کے تصور کے لحاظ سے کس درجہ واقعیت اور سچائی ہے؟

دینی حکومت اور اسلامی حکومت میں فرق:

شروع میں اس غلط فہمی کا دور کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دینی حکومت اور اسلامی حکومت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ عنوان مختلف ہے مگر معنوں ایک ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے ان دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے جو حکومت اسلامی آئیڈیالوجی کے مطابق دینی ہوگی وہ اسلامی ضرور ہوگی لیکن جو حکومت کسی خاص اعتبار سے اسلامی ہو اس کا دینی ہونا ضروری نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دینی حکومت کا ہر عمل دینی ہو یا دنیوی بہر حال اس میں تعبد اور تقرب الی اللہ کا پہلو غالب رہتا ہے پھر یہ حکومت کسی انسان کی۔ فرد ہو یا جماعت، نہیں ہوتی بلکہ **إِنِ الْحُكْمُ لِلَّهِ** کے مطابق صرف خدا کی ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کو حکومت الہیہ کہا جاتا ہے، اس حکومت کا صدر جو امام کہلاتا ہے اسے لوگوں پر مذہبی سیادت بھی حاصل ہوتی ہے اور سیاسی بھی، اسی لیے اس کا مستحق اور پیر مہنگا ہونا ضروری ہے۔ وہ گویا خدا کی طرف سے اس کے احکام کے اجراء و تنفیذ کا ذمہ دار ہوتا ہے اس حکومت میں آج کل کی جمہوریتوں کی طرح کی نہ دستور ساز اسمبلی ہو سکتی ہے اور نہ کونسلیں اور نہ پارلیمنٹ۔ قانون سازی کا حق سوائے علماء ربانیین کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ پھر اس میں نہ حلقہ وار انتخاب ہے اور نہ آبادی کے تناسب سے نمائندگی اس بنا پر یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ پاکستان گورنمنٹ کسی طرح بھی دینی حکومت نہیں کہلائی جاسکتی اور ایک یہ ہی کیا۔ خلافت راشدہ کے بعد یہ دینی حکومت رہی ہی کہاں سے؟ خود غرض بادشاہوں نے اپنے لیے ”ظل اللہ علی الامراض“ اور ”خليفة الله علی الناس“ ایسے کچھ القاب اختیار نہیں کیے۔

لیکن تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ خود ان کی اور ان کی مزعومہ خلافت کی حقیقت کیا تھی؟ جن لوگوں نے بنو امیہ کی نعشوں پر بیٹھ کر جشن دعوت منایا تھا خطبوں میں میز پر بیٹھ کر وہی اپنے آپ کو اللہ کے دین کے سب سے بڑے محافظ کہتے تھے تیمور لنگ جو جو سفاکی و بے رحمی کے میدان کا نامور مہر و تھا وہ بھی اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میں ہندوستان اسلام کے سرنگوں علم کو اونچا کرنے گیا تھا۔ بہر حال دعاوی خواہ کچھ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور کے بعد امامت - خلافت یا دینی حکومت صحیح معنی میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ عبدالملک بن مروان جو خلیفہ ہونے کے ساتھ بڑا عالم اور فقیہ بھی تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تم حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے تو اس نے کہا کہ ان کے زمانہ میں لوگ بھی تو تم جیسے نہیں تھے واقعہ یہ ہی ہے کہ کسی حکومت کی نوعیت کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ کیسے ہیں؟ اس بنا پر خلافت راشدہ بھی اگر خیر القرون سے آگے نہیں بڑھ سکی تو اچھے کی کیا بات ہے؟ اسی بنا پر ہم کو خوشی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم نے بڑی جرات سے اپنے بیان میں صاف کہہ دیا کہ ان کی حکومت دینی (Theocratic) نہیں ہے۔

اسلامی حکومت :

اب رہی اسلامی حکومت! تو اگر ہم اسلام سے مراد ایک مخصوص قسم کا نظام زندگی لیں — ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کمیونزم وغیرہ دوسرے قسم کے نظام ہاے زندگی رائج ہیں — تو اس نظام کو جس حد تک کوئی حکومت اختیار کرے گی وہ اسی درجہ تک اسلامی کہلائے گی۔ جہاں تک اس نظام کے معاشی - معاشرتی اور مادی مسائل کا تعلق ہے اس نظام کو مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اختیار کر سکتے ہیں اور پھر بھی وہ نظام اسلامی نظام ہی کہلائے گا۔ کسی غیر مسلم کے اپنانے سے وہ غیر اسلامی نہیں ہو جائے گا۔ مثلاً اقوام متحدہ کی کونسل نے آج انسانی حقوق کا چارٹر بنایا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی چارٹر ہے۔ اسی طرح ہماری پارلیمنٹ میں آج جو ہندو کو ڈبل پیش ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ بل اپنی متعدد دفعات کے اعتبار سے اسلامی قانون ہے،

دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح سمجھیے کہ مثلاً اگر ایک غیر مسلم کسی مظلوم کی مدد کر رہا ہے یا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچا رہا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا یہ فعل اسلامی ہے لیکن ہم اس کو دینی نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ دینی فعل پر احکام تعبتدی مرتب ہوتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ فاعل مسلمان ہو پس احکام دنیویہ کے اعتبار سے جس طرح ہمزوی طور پر زندگی کے کسی ایک شعبہ میں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ملک خواہ وہ مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا۔ یا دونوں کا اپنی حکومت کے لیے جو دستور مرتب کرتا ہے وہ اسلامی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور ملکی و وطنی معاملات۔ اقتصادی و معاشی مسائل، غیر قوموں کے ساتھ تعلقات صلح و جنگ کے قوانین وغیرہ ان سب چیزوں میں وہ اسلامی نظام کی پیروی کرتا ہے تو بے شبہ اس ملک کی حکومت۔ حکومتی امور کی حد تک اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ محض اسلامی حکومت کا نام سن کر یہ سمجھ لینا کہ یہ حکومت فرقہ وارانہ ہوگی، صحیح نہیں ہے اگر ایک کمیونسٹ یا سوشلسٹ گورنمنٹ کا مفہوم فرقہ وارانہ گورنمنٹ نہیں ہے تو اسلامی حکومت کہنا بھی فرقہ وارانہ گورنمنٹ کے مرادف نہیں ہو سکتا البتہ ہاں اگر اس حکومت کے آئین میں کسی فرقہ کی حق تلفی ہوئی ہو تو بے شبہ اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے مقالہ کا موضوع محدود ہے اس لیے گفتگو صرف غیر مسلموں کے درجہ و مقام تک ہی رہے گی !!!

قیام پاکستان کی نوعیت :

چونکہ کسی چیز کی نوعیت کے بدل جانے سے اس چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہمیں قیام پاکستان کی نوعیت معلوم کرنی چاہیے، ظاہر ہے یہ نوعیت اپنی حیثیت میں بالکل منفرد ہے۔ یعنی بعینہ اس کی کوئی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ البتہ اس کے مختلف پہلو ہیں جن پر تاریخ کے بعض واقعات سے روشنی پڑتی ہے اور اسی روشنی میں اس کے لیے احکام کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کی

صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ملک میں رہتے بستے ہیں اس ملک پر ایک اجنبی طاقت کا قبضہ ہے، ہندو اور مسلمان دونوں اس طاقت کو ملک سے نکال باہر کرنے اور اپنے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرتے ہیں، ایک عرصہ تک مشترکہ جدوجہد کرنے کے بعد چند ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کے باعث مسلمان تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں بڑی بڑی روکڑ کے بعد آخر ہندو اس تقسیم کو منظور کر لیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک آزاد ہو کر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے، ایک حصہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ہندو اقلیت میں اور دوسرے حصہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں چونکہ ہندوستان کے ہندو پاکستان کے ہندوؤں سے اور پاکستان کے مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے اور پھر دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اطمینان دلانے بغیر ملک کی تقسیم عمل میں نہیں آسکتی تھی اس بناء پر دونوں پارٹیوں میں جو ملک کی تقسیم کا معاملہ کر رہی تھیں یہ معاہدہ ہوا کہ ہر ملک کی اکثریت اپنی اقلیت کے ساتھ برابر کا معاملہ کرے گی اور اسے مساوی درجہ کے شہری حقوق دے گی، یہ معاہدہ تقسیم کے وقت کاغذ پر ایک سیاسی معاہدہ کی حیثیت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن کم از کم اخلاقی معاہدہ کی حیثیت سے ضرور ہوا ہے اور اس کا ثبوت وہ بیانات و اعلانات ہیں جو اس زمانہ میں دونوں پارٹیوں کے ذمہ دار لیڈروں نے کیے اور دیئے تھے۔

پس یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کا قیام نہ مسلمانوں کی فوج کشی سے ہوا ہے اور نہ تلوار سے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ باہمی سمجھوتہ اور معاہدہ کی رو سے ہوا ہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک ایسے ملک میں رہ جاتے ہیں جہاں اگرچہ اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن اس ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کی عبادت گاہیں ہیں۔ مدارس ہیں۔ ملی ادارے ہیں، اور جا بجا ان کے تاریخی و مذہبی آثار بکھرے پڑے ہیں، ان دونوں امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد اصل مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے حسب ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے

ہیں اور انہیں کی روشنی میں موضوع گفتگو کا تصفیہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں۔

(۲) معاہدہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

(۳) ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری اور آئینی پوزیشن کیا ہے۔

(۴) اس پوزیشن کے پیش نظر پاکستان کا اپنی اقلیت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا

چاہیے۔

اب ہم ان امور تنقیح طلب میں سے ہر ایک پر نمبر وار گفتگو کرتے ہیں۔

مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں!

یوں تو تاریخ اسلام میں ہر قسم کے معاہدے ملتے ہیں یہاں تک کہ ہارون رشید نے شارلمان کے ساتھ اسپین کی اموی حکومت کو ختم کرنے کے ارادہ سے دوستانہ عہد نامہ کیا تھا۔ لیکن عہد نبوت کے دو معاہدے ہیں جو اسی قسم کے مسائل کے لیے ایک بنیادی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ سے جو معاہدہ کیا تھا وہ اس درجہ مشہور ہے کہ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں البتہ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اس معاہدہ میں بہ ظاہر مسلمانوں کا پلہ قریش مکہ کے مقابلہ میں کچھ بھاری نہیں تھا۔ چنانچہ قریش کے نمائندہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے نام مبارک کے ساتھ ”رسول اللہ“ لکھنے پر اعتراض کیا تو باوجود بعض صحابہ کے احتجاج کے آپ نے اس کو خود اپنے دست مبارک سے مٹا دیا، اسی طرح معاہدہ میں ایک دفعہ تھی کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمانوں سے آملے گا تو اس کو مکہ واپس کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی ادھر کا آدمی مکہ پہنچ جائے گا تو قریش پر اس کا واپس کرنا لازمی نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر آپ سے تند لہجہ میں احتجاج کیا جس کی ندامت ان کو مدت تک رہی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفعہ کو بھی منظور فرمایا، پھر صلح حدیبیہ کا واقعہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ اگر کسی وجہ سے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ ناگزیر ہو جائے اور اس میں مسلمانوں کا

پہلو مادی اور فوری نفع کے اعتبار سے کچھ دبا ہوا بھی نظر آئے تو مسلمانوں کو اللہ کی مدد کے بھروسہ پر یہ معاہدہ ضرور کر لینا چاہیے، خدا نے چاہا تو یہ ہی معاہدہ ان کی آخری حیات کا سبب ہوگا۔

صلح حدیبیہ کے واقعہ کے علاوہ ایک اور معاہدہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کر کے پہنچنے کے بعد وہاں کے مختلف یہودیوں سے کیا تھا۔ پاکستان کی اقلیت کے شہری حقوق پر اس معاہدہ سے خاص طور پر روشنی پڑتی ہے۔ سیرت ابن ہشام اور کتاب المغازی وغیرہما میں اس کا مفصل تذکرہ ہے، ہمارے موضوع بحث سے اس معاہدہ کا صرف یہ حصہ متعلق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) یہودیوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی وحدت بنائی تھی، چنانچہ اس عہد نامہ کی پچیسویں دفعہ کا مضمون ہی یہ تھا کہ ”بنوعوف کے یہودی مومنوں کے ساتھ ایک امت (ایک قوم یا ایک سیاسی وحدت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین موالی ہوں کہ اصل ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کرے گا تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا پھر دفعہ ۳۷ الف میں ارشاد ہوا تھا کہ ”جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان یہودیوں اور مسلمانوں میں باہم امداد و عمل میں آئے گی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور یہی خواہی ہوگی اور وفا شعار رہی ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔“

پروفیسر یارون خاں شیروانی سابق صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن اس معاہدہ کی نسبت بجا طور پر فرماتے ہیں کہ:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر بڑی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت اس طرح دکھائی کہ آپ نے یہودیوں کے لیے ایک دستور مرتب فرمایا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہودی بھی مسیٰ اسٹیٹ کے ایسے ہی شہری ہیں جیسے کہ خود مسلمان اور شریہ سمجھے لوگوں کی دونوں شاخیں مل کر ایک قوم ہیں۔“

معاہدہ کی ذمہ داریاں :

اسلام کا اصل مقصد ہی تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن ہے، اس بنا پر منافقت اور
دل و زبان کی مخالفت سے بڑھ کر اس کے نزدیک کوئی اور گناہ نہیں ہے۔ قرآن مجید
میں ہے :

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

اسی لیے معاہدہ پر قائم رہے اور عہد و پیمان پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید
جتنی اسلام میں ہے کہیں اور نہیں ملے گی۔ اسلام کے نزدیک شرک سے زیادہ
بیچ اور کیا چیز ہوگی لیکن اس کے باوجود حکم ہے کہ مشرکوں سے بھی اگر کوئی معاہدہ
کر لیا گیا ہے تو جب تک وہ خود نہ توڑیں تم ہرگز نہ توڑو۔ سورۃ التوبہ میں ہے :

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْنَا مِنْ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوا
شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتُوا إِلَيْهِمْ
عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے :

فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۝

معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ
جو معاہدہ کیا گیا ہے مسلمانوں کی امداد سے اگر اس کا نقص لازم آتا ہو تو حکم ہے
کہ معاہدہ کی پابندی کرو اور مسلمانوں کی مدد نہ کرو۔ چنانچہ سورۃ انفال میں ہے :

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ

يُهَاجِرُوا مَا لَكُمْ مِنْ

وَلَا يَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ

يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ

فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ

إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور

ہجرت نہیں کی تم کو ان کی کوئی

ولایت (نگرانی) نہیں پہنچی جب تک

کہ وہ ہجرت کریں اور اگر یہ لوگ

دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں

تو ان کی مدد تم پر لازم ہے لیکن ہاں

بَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ ط . ان لوگوں کے برخلاف نہیں جن کے ساتھ کہ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔

غور کرو یہ آیت ہندوستان کے مسلمانوں پر جنہوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور پاکستان کی اقلیت جن کے ساتھ وہاں کی گورنمنٹ کا عہد ہے کس طرح منطبق ہو رہی ہے۔

چند فقہی حزیات :

قرآن مجید کی انہیں آیات اور بعض احادیث کو بنیاد بنا کر فقہانے جزیات مستنبط کیے ہیں ہم ذیل میں ان میں سے چند بیان کرتے ہیں۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ:

”اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے چلا گیا ہے اور اس نے وہاں کسی کا مال غصب کر لیا ہے یا کوئی نقصان پہنچا دیا ہے تو اگر اس کے بعد وہ مسلم حکومت میں پھر واپس آجائے اور جن لوگوں کا مال غصب کیا تھا وہ مسلم حکومت میں آکر اس مسلمان کے خلاف استغاثہ کریں تو مسلمان عدالت اس استغاثہ کو نہیں سنے گی کیونکہ یہ واقعہ مسلم حکومت کے حدود کے باہر پیش آیا تھا چنانچہ اسی بنا پر اگر معاملہ برعکس ہو یعنی جو مسلمان غیر مسلم ملک میں چلا گیا تھا اس کے مال یا جائداد کو وہاں کے لوگوں نے کوئی نقصان پہنچا دیا ہے، اور یہ شخص اپنے ملک میں واپس آکر ان غیر مسلموں کے خلاف کوئی استغاثہ کرے تو مسلم عدالت اس استغاثہ کو بھی نہیں سنے گی۔ البتہ جہاں تک غیر مسلم حکومت میں رہ کر مسلمان کے کسی غیر مسلم کے مال کو غصب کرنے کا تعلق ہے تو چونکہ اس نے غیر مسلم حکومت کے ساتھ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے اس پر دباؤ ضرور ڈالا جائے گا کہ وہ مال اس کے مالک کو واپس کر دے اور کوئی مسلمان اس کو نہ خریدے۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی شخص معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا

قیامت کے دن اس کے سر پر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دھوکہ باز تھا یا نہیں۔

اگر ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت سے اجازت لے کر چلا گیا ہے تو اسے جن شرائط پر یہ اجازت ملی ہے اس کا اسلامی فرض ہے کہ وہ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ان شرائط کو پورا کرے، یہاں تک کہ اگر اس درمیان میں اسلامی ملک اور اس غیر مسلم حکومت میں جنگ چھڑ جائے تو اس مسلمان کا فرض ہے کہ غیر مسلم حکومت میں رہتے ہوئے اپنی اسلامی حکومت کی حمایت میں کوئی حرکت غیر مسلم حکومت کے خلاف ہرگز نہ کرے ورنہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

اسی سلسلہ میں علامہ رخصی لکھتے ہیں کہ اگر دونوں ملکوں کی جنگ کی صورت میں اسلامی ملک کی عورتیں اور بچے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم (ذمی) گرفتار ہو کر غیر مسلم ملک میں جہاں وہ مقیم ہے لائے جا رہے ہوں اور وہ محسوس کرے کہ وہ ان عورتوں اور بچوں کی مدد کر سکتا ہے تو اس کو چاہیے کہ غیر مسلم حکومت نے اس کو جو امن دے رکھا ہے پہلے وہ اس سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دے اور پھر ان عورتوں اور بچوں کی مدد کرے، اس جہزیرہ میں دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) جب تک وہ غیر مسلم حکومت کے دیے ہوئے امن کو روک دینے کا اعلان نہیں کرے گا خود اپنے ملک کی عورتوں اور بچوں کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ عہد شکنی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

(۲) ان عورتوں اور بچوں میں مسلمان اور غیر مسلمان کا کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کو جو اسلامی ملک کے باشندہ ہوں جہاں کا وہ خود بھی شہری ہے، ایک ہی حکم دیا گیا ہے۔

عدل گستری :

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں انسان کو اپنے قول و قرار کا دھیان نہیں رہتا اور وہ ایسا کام کر بیٹھتا ہے جو اسے اپنے عہد و پیمان کے مطابق نہ کرنا چاہیے تھا۔ قرآن مجید میں اس پر بھی نہایت سختی سے متنبہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ
قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَا تَعْدِلُوْا
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰی۔

خبردار کسی قوم کا بغض تم کو اس پر آمادہ
نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو نہیں بلکہ
تم انصاف ہی کرو، یہ ہی تمہارے لیے
پاکی کا سب سے قریبی راستہ ہے۔

اسلام نے عدل کی اہمیت و عظمت مسلمانوں کے دل و دماغ پر کس درجہ حاوی کر دی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سیاست نامہ کا مصنف لکھتا ہے :

”حکومت کفر کے ساتھ رہ سکتی ہے لیکن ظلم اور نا انصافی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔“

مسلمان حکمرانوں نے عدل کی جو نادرہ روزگار مثالیں قائم کی ہیں تاریخ کے صفحات ان سے بھرے پڑے ہیں، خود ہندوستان میں دہلی سلطنت کے بعض واقعات ایسے ہیں جن پر آج یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کو کون نہیں جانتا کس قدر تند مزاج اور درشت طبع بادشاہ تھا لیکن اسلام نے جو ایک خاص ماحول پیدا کر دیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ ابن بطوطہ قیام دہلی کے زمانہ کا خود اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ہندو نے قاضی کی عدالت میں فریاد کیا کہ بادشاہ نے اس کے لڑکے کو بلاوجہ و خطا مارا ہے، قاضی نے عدالت میں بادشاہ کو مدعی علیہ کی حیثیت سے طلب کیا۔ محمد بن تغلق عدالت میں آیا تو قاضی کو تاکید کی کہ وہ اس کے احترام کے لیے کھڑا نہ ہو۔ مقدمہ شروع ہوا اور قاضی

نے دونوں طرف کے بیانات وغیرہ سننے کے بعد فیصلہ بادشاہ کے خلاف کیا۔ اس پر بادشاہ نے کوڑا خود ہندو لڑکے کے ہاتھ میں دیا اور باصرار کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی اسی طرح مار۔ یہ واقعہ ضیاء الدین برنی نے بھی بیان کیا ہے اور دوسرے مورخوں نے بھی اسے نقل کیا ہے، لیکن ابن بطوطہ نے اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات محمد بن تغلق کے متعلق بیان کیے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ سلطان میرا مقروض ہے تو نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان خود قاضی کے سامنے مدعی اعلیٰ کی حیثیت سے پیش ہوا اور عدالت کے فیصلہ کے مطابق اس نے قرض ادا کیا۔

غیاث الدین بلبن کو ایک گورنر کی نسبت معلوم ہوا کہ اس نے کسی شخص کو نشہ کے عالم میں قتل کر دیا ہے تو اس نے گورنر کو سخت ترین سزا دی، سلاطین ہلی نے ”حبہ“ کے نام سے ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ اس محکمہ کا افسر محتسب کہلاتا تھا اور اس کا فرض عصامی کے بقول یہ تھا کہ وہ ملک میں کسی قسم کی اخلاقی بے عنوانی نہ ہونے دے، اور کوئی طاقت ور کسی کمزور پر دست درازی نہ کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن :

اب آئیے یہ دیکھیں کہ بھارت میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے پیش نظر اوروں سے تعلیمات اسلام پاکستان میں وہاں کی اقلیتوں کی حیثیت (Status) کیا ہونی چاہیے، ظاہر ہے کہ بھارت کے دستور نے یہاں کی حکومت کو غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ قرار دیا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو بھی بھارت کا ایسا ہی نیشنل مانا گیا ہے جیسا کہ خود ہندو ہیں اور شہری حقوق اور شہری آزادی کے لحاظ سے ان میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے ہر محکمہ اور ہر منصب کے دروازے ہندو اور مسلمان دونوں پر یکساں کھلے رکھے گئے ہیں اور پورے طور پر نہ سہی جو بعض ناگزیر اسباب کا نتیجہ ہے کسی نہ کسی شکل میں اس کا عملی ثبوت موجود بھی ہے۔ پس جہاں تک دستور ہند، گورنمنٹ کی پالیسی اور ذمہ داران حکومت

کے اعلانات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو اکثریت کے برابر حقوق دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فقہانے لکھا ہے جس ملک میں ایسی صورت حال ہو یعنی اس میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنے معاملات میں آزاد ہوں اور حکومت میں کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کا بھی دخل ہو وہ ملک مسلمانوں کے لیے دارالاسلام ہی کہلائے گا۔ چنانچہ درمختار میں ہے :

و دارالحر تصیر دارالاسلام
باجراء احکام الاسلام فیہا
کجمعة وعید -
اور غیر مسلموں کا ملک جمعہ اور عید ایسے
احکام کے جاری ہو جانے سے
دارالاسلام ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس مسئلہ کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

وبہذا ظہر بجبل الدرور
وبعض البلاد التابعة لہ
کلھا دارالاسلام لانہا
وان کانت لہا احکام
درور اونصاری ولہم
قضاة علی دینہم وبعضہم
یعلنون بشتم الاسلام
والسلبین لکنہم تحت
حکم ولایة امورنا لہ
اور جبل درور (شام) اور اس کے
بعض ملحقہ شہروں میں ایسا ہوا بھی ہے۔
یہ تمام شہر دارالاسلام ہیں۔ کیونکہ یہاں
اگرچہ درور یا عیسائیوں کے احکام
چلتے ہیں اور انھیں کے ہم مذہب
حج بھی ہیں جن میں سے بعض بعض
اسلام اور مسلمانوں کو کھلے بندوں
و شتم بھی کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمارے
حکام کے نیچے ہیں (یعنی یہاں مسلمان
حاکم بھی ہیں جن کے ماتحت یہ لوگ بھی ہیں)

احسان کا بدلہ احسان :

پس جب کسی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن یہ ہو تو اب اس کے

ہمسایہ اسلامی ملک کا دینی اور مذہبی فرض ہے کہ بحکم ہل جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا
 الاحسان اپنے ہاں کے غیر مسلموں کو بھی یہی مرتبہ اور مقام دے۔ فقہ کی
 کتابوں میں عام طور پر یہ حکم پایا جاتا ہے کہ اگر دارالحرب کی حکومت مسلمانوں کے
 ساتھ کوئی مراعات کر رہی ہے تو اسلامی حکومت کو چاہیے کہ اس کے جواب میں
 وہ بھی دارالحرب کے رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ اس جیسا بلکہ اس سے بھی اچھا
 معاملہ کرے۔ چنانچہ شرح وقایہ میں ہے :

وان علم قدرا ما اخذنا	غیر مسلم حکومت مسلمانوں سے جو کسٹم
منا اهل الحرب فعاشرنا	ڈیوٹی وصول کرتی ہے اگر اس کی مقدار
ياخذنا من الحربى مثل	ہم کو معلوم ہو تو ہماری اسلامی حکومت
ذالك -	کا کسٹم آفیسر بھی غیر مسلم سے اتنی ہی کسٹم ڈیوٹی
	لے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجہ بالا حکم
 صرف اس وقت ہے جب کہ غیر مسلم کا مال تجارت بقدر نصاب ہو اور غیر مسلم حکومت
 مسلمان سوواگر سے اس کے مال کا کچھ حصہ بطور کسٹم ڈیوٹی کے وصول کرتی ہو، ورنہ اگر
 غیر مسلم حکومت مسلمان تاجر کا پورا مال ہی قبضہ میں کر لیتی ہو یا غیر مسلم کا مال بقدر
 نصاب نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں اسلامی حکومت غیر مسلم حکومت کی پیروی
 نہ کرے گی بلکہ اس کے جبر و تشدد اور ظلم کے باوجود خود وہ ہی کرے گی جو اسے
 از روئے انصاف کرنا چاہیے، شرح وقایہ میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد
 ہی ہے۔

لو اخذوا كل اموالنا	اگر غیر مسلم حکومت کے عمال مسلمانوں کے
فعاشرنا لا ياخذنا كل	کل مال پر قبضہ کر لیتے ہوں تو ہمارا کسٹم
اموال الحربى البار ولا	آفیسر غیر مسلم مسافر کے کل مال پر قبضہ نہیں

من قلیلة وان افر بباتی
النصاب فی بیتہ -

کرے گا، اسی طرح اگر اس مسافر کا مال
نصاب سے کم ہو تو اس وقت بھی وہ کسٹ ڈیوٹی
نہیں لے گا اگرچہ یہ شخص ڈیوٹی دینے پر
مصر ہو اور کہتا ہو کہ اس کے گھر میں مال
بقدر نصاب موجود ہے۔

صاحب درمختار نے اس کی جو توجیہ کی ہے ذرا وہ بھی سن لیجیے فرماتے ہیں:

لانه ظلم ولا متابعه
علیه۔

غیر مسلم حکومت میں مسلمان سوداگر کے پورے
مال کے ہتھیائے جانے کے باوجود اسلامی
حکومت میں غیر مسلم مسافر کے پورے مال پر بطور
جوابی کارروائی کے قبضہ نہیں کیا جائے گا۔
کیوں کہ ایسا کرنا ظلم ہے اور پیردی ظلم میں
نہیں ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر غیر مسلم حکومت میں مسلمان تاجر سے ڈیوٹی بالکل نہ لی جاتی ہو
تو اسلامی حکومت اس کے جواب میں غیر مسلم سوداگر سے بھی کچھ نہ لے گی خواہ اس
کا مال کتنا ہی زیادہ ہو، اس کی وجہ کیا ہے؟ صاحب درمختار لکھتے ہیں:

لیستموا علیہ ولانا
احق بالہکامہ۔

ہم ایسا اس لیے کریں گے تاکہ غیر مسلم
حکومت مسلمان تاجروں کے ساتھ اس اچھے
معاملہ کو جاری رکھے اور پھر عمدہ اخلاق
تو ہم کو بدرجہ اولیٰ دکھانے چاہئیں۔

جو لوگ بات بات میں انتقام انتقام کا نعرہ لگانے کے خوگر ہیں انہیں دل کی
آنکھ کھول کر ان تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اسلام کس طرح ہر حالت میں عدل
وانصاف کے بلند مقام سے نیچے نہیں اترتا۔

سطور بالا میں جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس کی روشنی میں اب یہ بات بالکل واضح

ہو جاتی ہے کہ :

(۱) پاکستان کا قیام چونکہ ہندو مسلم سمجھوتہ سے ہوا ہے اور اس مفہومت کے ساتھ ہوا ہے کہ پاکستان کی اقلیت کو وہاں کے مسلمانوں کے برابر شہری حقوق ملیں گے۔ اس بنا پر اسلامی حکومت ہونے کا ہی تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مساوی درجہ کے شہری حقوق دیے جائیں اور اس بارہ میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جائے۔

(۲) اگر قیام پاکستان اس سمجھوتہ کے ساتھ نہ بھی ہوتا تب بھی چونکہ ہندستان میں مسلمانوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل ہیں، اس بنا پر پاکستان گورنمنٹ کا یہ اسلامی فرض تھا کہ وہ بھارت کے مسلمانوں کی خاطر اپنے ہاں کی غیر مسلم اقلیت کو یہ حقوق و مراعات دے۔

دہلی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پاکستان کا قیام تو باہمی سمجھوتہ اور آپس کے معاہدے کے ساتھ ہوا ہے یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے جس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا انھوں نے اس میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا ہے۔ پوری تاریخ کو چھوڑ دیجیے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سے بھی عہد مغلیہ پر صرف نظر کر لیجیے کہ مغلوں کا جو معاملہ رہا ہے سوائے اوزنگ رحمتہ اللہ علیہ کے اور کسی بادشاہ سے ہندوؤں کو بھی شکایت نہیں رہی۔ صرف دہلی سلطنت کو لیجیے اس سلطنت کا معاملہ یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ یہ تھا کہ معز الدین کی قباد نے حکومت کے طلائی سکہ تک پر ہندو دیوی کی تصویر نقش کر لے رکھی تھی۔ برہمنوں اور مندروں کے پجاریوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور ان کو ٹیکس سے آزاد رکھا گیا تھا، ہندوؤں کی غیر انسانی رسم یعنی ستی تک کو ایک مذہبی رسم ہونے کی وجہ سے باقی رہنے دیا گیا تھا۔

(1) The foundation of muslim rule in India. p. 300.

مذہبی آزادی کا یہ عالم تھا کہ فیروزعلی خود اس کا اقرار کرتا ہے کہ "ہر روز ہندو میرے محل کے نیچے سے سنگھ اور گھنٹی بجاتے ہوئے گزرتے ہیں تاکہ جمناکے کنارہ پر پہنچنے پر اپنے بتوں کی پوجا کریں۔ میں اسلام کا محافظ ہوں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ فصول پیتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور خود میرے دارالسلطنت میں مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ شان و شوکت اور طمطراق سے رہتے ہیں ان کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ دہلی کے پرانے قلعے سے ایک کتبہ جو فارسی اور سنسکرت میں لکھا ہوا ہے دستیاب ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ بارہ بیگہ زمین حکومت کی طرف سے ایک مندر کے لیے عطا کی گئی تھی جو سری کرشن کے نام پر نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔"

اس سلطنت میں ہندوؤں کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ برنی کو شکایت ہے کہ خاص دہلی شہر میں ہندو بڑے بڑے شان دار محلات میں رہتے ہیں، اعلیٰ قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر طمطراق سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مسلمان نوکر ان کے گھوڑوں کے آگے دوڑے دوڑے چلتے ہیں۔ ان ہندوؤں کو جب مسلمان خطاب کرتے ہیں تو راسے۔ رانا۔ ٹھاکر۔ شاہ۔ ہتتا اور پنڈت وغیرہ ایسے باعزت القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں۔

آخری گزارش:

آخر میں یہ گزارش اور کرنی ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوست کہتے ہیں کہ پاکستان گورنمنٹ جب تک اسلامی حکومت رہے گی، اور سیکولر گورنمنٹ نہیں بنے گی وہاں کی اقلیت میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکتی، عرض یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا جب تک عنوان قائم رہے گا وہاں کی گورنمنٹ اور عوام پر خدا تعالیٰ کا خوف اور مذہب کا پاس غالب رہے گا، اور اس بناء پر وہ اقلیت کے ساتھ مساویانہ برتاؤ اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کریں گے۔ اس کے برخلاف سیکولر گورنمنٹ ہونے کی شکل میں جب تک عوام انتہائی شائستہ نہ ہوں خاطر خواہ نتائج کی امید نہیں ہو سکتی۔

(برہان، دہلی، مئی، ۱۹۵۰ء)

۱۱۰ ضیاء الدین برنی ص ۶۱ - مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے :

اسلامی جمہوریہ پاکستان

(تاریخ کا ایک اہم واقعہ)

گزشتہ مہینہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۲۳ مارچ کو ہمارے پڑوس میں ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ قائم ہو گیا۔ جمہوریہ کے معنی یہ ہیں کہ وہاں حکومت کسی خاص ایک طبقہ یا گروہ کی نہیں ہوگی بلکہ سب اہل ملک کی ہوگی اور ملک کے ہر باشندہ کو بلا تفریق مذہب و ملت یکساں شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی کو کسی پر کوئی تفوق نہ ہوگا۔ اور قانون کی نگاہ میں سب کی حیثیت یکساں اور برابر ہوگی۔ اس جمہوریہ کو ”اسلامی“ کی صفت سے موصوف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کی گورنمنٹ اور وہاں کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کر لیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ اپنے ہر قول و عمل کے لیے خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ اور مسئول ہیں۔ اور ان کا جو قدم بھی اٹھے گا وہ اسی تصور اور اسی یقین کے ماتحت اٹھے گا۔

ایک جمہوریہ میں حکومت عوام کی ہوتی ہے اور عوام کے لیے ہوتی ہے وہ خود اپنی صواب دید سے ایک دستور بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کا عہد و پیمان کرتے ہیں، لیکن انسان جس طرح اپنی انفرادی زندگی میں اپنی خواہشات اور جذبات سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اپنی جماعتی زندگی میں بھی وہ جماعتی عصبیت سے یکسر الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اس بنا پر کوئی کام خواہ کتنی ہی نیک نیتی اور ایمان داری سے کیا جائے، اس میں بہر حال غلطی اور نقص کا احتمال رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریتیں ایک مرتبہ اپنا دستور بنانے کے بعد اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و تہذیب اور رد و بدل کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جو خدا تعالیٰ

کا قانون ہے اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ اپنے ہر عمل کے لیے خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ سمجھنے اور یقین کرنے کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے عمل میں زیادہ خلوص جو شش اور استواری پیدا ہو جاتی ہے اور زندگی کے متعلق اس کا نقطہ نظر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایک اسلامی جمہوریہ صحیح معنی میں اسلامی جمہوریہ ہو تو وہ اپنوں کے لیے بھی رحمت ہے اور پراپوں کے لیے بھی۔

اسلام کا بنیادی اصول زندگی یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ دنیا میں جب کبھی اور جہاں کہیں اس اصول پر عمل کیا گیا ہے زندگی باغ و بہار بن گئی ہے، اور جب کبھی اس سے انحراف ہوا تو جس درجہ کا انحراف تھا اسی درجہ کی تباہی اور بربادی آئی ہے۔ اسلامی تصور حیات کے ماتحت ایک شخص یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہے کہ اگر اس نے خدا تعالیٰ کے کسی بندہ کے ساتھ نا انصافی کی یا اس کی حق تلفی کی ہے تو اگرچہ اس کی دولت و ثروت اور طاقت و قوت کی وجہ سے یہاں کی حکومت اور قانون، عدالت اور پولیس اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن حکم ”فَسَنْ يَّعْمَلُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝“ خدا سے احکم الحاکمین کو وہ کوئی جُل نہ دے سکے گا اور اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہ لے سکے گا۔ اسی تصور حیات اور اس کے پس منظر میں اسی عقیدہ یوم آخرت کا یہ اثر تھا کہ محمد بن تعلق اور فیروز شاہ تعلق جیسے باجاہ و جلالت بادشاہوں نے معمولی حیثیت کے ہندوؤں کے استغاثہ پر اپنے آپ کو بے تکلف قاضی کی عدالت میں جواب دہی کے لیے پیش کر دیا اور قاضی کا فیصلہ ایک معمولی حیثیت کے انسان کی طرح بصد رضا و رغبت سنا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے، اور یہ ایک دو نہیں تاریخ میں اس طرح کے سیکڑوں واقعات ملیں گے۔

اسلامی جمہوریہ ہونے کی بنا پر پاکستان کی اقلیتیں پاکستان گورنمنٹ اور وہاں

کی اکثریت کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہیں، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد ”وَ كُنْتُمْ مَسْئُولُونَ عَنْ رِعَايَتِهِ“ کے مطابق ان کا یہ فرض ہے کہ ان اقلیتوں کے ساتھ صرف مساوات اور برابری کا نہیں، بلکہ ایثار۔ فیاضی اور کشادہ دلی کا معاملہ کریں۔ اسلام میں تالیفِ قلب کی بڑی اہمیت ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مؤلفۃ القلوب کو عام مسلمانوں سے زیادہ حصہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ غزوہ حنین کے موقع پر انصارِ مدینہ کو اس پر کچھ شکایت ہوئی تو اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غضب ناک ہو کر ایک تقریر کی اور اس میں آپ نے فرمایا کہ اے انصار تم تو مسلمان ہو۔ اسی لیے میں نے تم کو اسلام کے حوالے کر دیا ہے۔ رہے یہ لوگ تو میں ان کی تالیفِ قلب (دل جوئی) کرتا ہوں۔ تم اس پر کیوں برا مانتے ہو۔

بہر حال پاکستان نے اپنے متعلق ”اسلامی جمہوریہ“ کا اعلان کر کے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے، آئندہ تاریخ بتائے گی کہ پاکستان نے اس اعلان کے ذریعہ اسلام کی آزمائش اور جانچ کا جو موقع دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں کہاں تک وہ اپنے حسن عمل و کردار سے اسلام کو نیک نام ثابت کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ ہمارا یہ پڑوسی ملک صحیح معنی میں اسلامی جمہوریہ ہو، اور وہ اپنے عمل اور حسن اخلاق و بلند کردار کا ایسا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے جو خدا ناشناس جمہوریتوں کے لیے لائق تقلید ہو، اور جس سے دنیا میں انسانیت نوازی، شرافت و حریت اور امن پسندی و صلح گستری کی اعلیٰ مثال قائم ہو۔

(برہان، دہلی۔ اپریل ۱۹۵۶ء)

ہندوستان اور پاکستان

(نہرو لیاقت معاہدے کی روشنی میں)

نہرو لیاقت معاہدہ کے بعد سے اب تک اگرچہ بھارت اور پاکستان میں کہیں کوئی بڑا واقعہ سننے میں نہیں آیا اور اس معاہدے کے بہت سے خوش گوار نتائج کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ کہنا دوپہر کے چمکتے سورج سے انکار کرنا ہوگا کہ اس سے دونوں ملکوں کی اقلیت میں اطمینان و اعتماد پیدا ہو گیا ہے، اور اب ان میں خوف و ہراس یا مستقبل کی طرف سے بے چینی و مایوسی کا احساس نہیں رہا ہے جیسا کہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے، دونوں ملکوں میں آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری ہے، کسی دن آنے والے کم ہوتے ہیں اور کسی دن جانے والے اور یہ تعداد سیکڑوں کی نہیں بلکہ روزانہ ہزاروں تک کی ہوتی ہے، پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اب جو ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں اقلیتی فرقے کے لوگ پہنچ رہے ہیں وہ ہنگامی حالات کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ اب یہ ہنگامی حالات ہیں ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور آخری فیصلہ کر کے بلکہ ان میں بہت سے وہ ہوں گے جنہوں نے دوسرے ملک میں جہاں وہ آ رہے ہیں پہلے سے اپنی رہائش اور معاش کا انتظام کر لیا ہوگا، اس بناء پر زمانہ امن میں اقلیت کی ایک ملک سے دوسرے ملک میں حرکت زمانہ فساد کی نقل و حرکت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز ہے، اور اگر دن رات یہی رہے تو دونوں حکومتیں مابین یا نہ مابین اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عملاً خود بخود آبادی کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اور دونوں ملک دو مستقل دشمن کیمپوں میں منتقل ہو جائیں گے۔

خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہوا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس چھوٹے سے

بڑا عظیم کا حشر وہی نہ ہوگا جو آج کوریا کا ہو رہا ہے۔ یہ ملک بھی ایک ہی تھا۔ جنگ عظیم دوم کے اثرات نے اس کو جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کا طبعی نتیجہ منافرت و عداوت باہمی ہوتا ہی ہے، چنانچہ ملک کے دونوں منقسم حصوں کے لوگوں میں بد مزگی، تلخی اور دشمنی پیدا ہو جانے کی وجہ سے آئے دن جھڑپیں ہونے لگیں، اور شدہ شدہ ان کا یہ انجام ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے میدان جنگ میں دست و گریہاں ہو گئے، اب سوچئے کہ بھلا کس کا ہوا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بھلا کسی کا بھی نہیں ہوا بلکہ دونوں نے اپنے اوپر تباہی اور بربادی کو مسلط کر لیا ہے۔ جیت اگر ہوگی تو روس کی یا امریکہ کی ہوگی۔ کوریا کا حال تو یہ ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر پچاس لاکھ سے زائد انسان گھر سے بے گھر ہو کر ایک وقت کی روٹی تک کو محتاج ہو گئے ہیں، ہزاروں خاندان بے چشم و چراغ ہو گئے۔ صنعتی و حرفتی ادارے دم کے دم میں کھنڈر بن گئے، اور بھری بھری آبادیاں چشم زدن میں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں پس جو اسباب کوریا کی تباہی کے تھے وہی ہندوستان میں پیدا ہو رہے ہیں، اور جن ہاتھوں نے لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو ہوادے کر ایک دوزخ بنا دیا وہی ہاتھ یہاں بھی مصروف عمل ہیں۔

نہرو یاقوت معاہدہ جس جذبہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے اچھا ہونے میں کلام نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں فرض شناس اور ساتھ ساتھ مطالبات فرض کی عملی تکمیل و تعمیل میں جبری و بے باک ہوتیں تو اس معاہدہ کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اعلان دستور کے مطابق ہندو پاکستان کا اور مسلمان بھارت کا شہری ہے، اور اس بنا پر ہر حکومت کا فرض ہے کہ قطع نظر اس سے کہ دوسرے ملک میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے ملک کے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آجوں کی حفاظت کرے اگر ذرا باریک نگاہی سے غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا یہ معاہدہ دہلی اس بات کی نشانی اور اس حقیقت کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ

دونوں حکومتیں بحیثیت حکومت کے اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر رہی ہیں، اور اس لیے معاہدہ کی آڑ لے کر دونوں اپنے اپنے گناہوں کو چھپانا چاہتی ہیں، دو شخص ایک گناہ میں شریک ہو کر جس طرح ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان دونوں حکومتوں نے بالواسطہ اقرارِ جرم کر کے اپنے جرم کے لیے ایک عذر پیدا کیا ہے۔

اس طرح خونِ ناحق کا تیز رنگ دونوں حکومتوں کے دامن پر پھیکا ہوا یا نہیں یہ تو تاریخ کی عدالت بتائے گی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کی بے اعتمادی و بے چینی کے اسباب قطعاً نفسیاتی ہیں اور جب تک ان کا تدارک نہیں کیا جائے گا اعتماد بجا نہیں ہو سکتا، ان اسباب کا تدارک اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور جس کا بار بار اعلان کیا گیا ہے، ایمانداری اور پوری سچائی کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے اور دلوں کو صاف اور دماغ کو پاک کر کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جائے جہاں تک اس عمل اور اس کی ضرورت کا تعلق ہے دونوں حکومتوں کا فرض یکساں اور برابر ہے، لیکن ہمارے نزدیک پاکستان کا فرض اور اس معاملہ میں اس کی ذمہ داریاں بہ نسبت بھارت کے اور بھی کہیں زیادہ ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں:

(۱) ہندوستان کی تقسیم ارباب پاکستان کے مطالبہ اور ان کے اصرار پر ہوئی ہے، اس لیے تقسیم سے جو خرابیاں، بد مزگیاں اور تلخیاں پیدا ہو گئی ہیں پاکستان کا فرض اولین ہے کہ وہ ان کا تدارک اور ان کی اصلاح کرے۔

(۲) پاکستان میں ہندو صرف ایک کروڑ ہیں لیکن بھارت میں مسلمانوں کی تعداد $3\frac{1}{4}$ کروڑ ہے، اگر ایک کروڑ وہاں برباد ہوئے تو یہاں ان سے ساڑھے تین گنا زیادہ برباد ہو جائیں گے۔

(۳) بھارت ایک وسیع اور زرخیز و آباد ملک ہے، اس لیے ہندوؤں کو بھارت

میں آکر آباد ہونا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے، جتنا کہ بھارت کے مسلمانوں کا پاکستان میں پہنچ کر آباد ہونا۔

(۴) پاکستان کو اسلامی حکومت کہا گیا ہے، اس لیے ہندوؤں کا اس سے بد دل ہونا اور خصوصاً مغربی پنجاب وغیرہ کے مظالم کے بعد۔ ایک بالکل نفسیاتی چیز ہے۔ اسلام بے شبہ ایک مکمل نظام عدل و انصاف ہے، لیکن ایک غیر مسلم کے دل میں اس حقیقت کا اعتراف آپ اپنے عمل ہی سے جاگزیں کر سکتے ہیں۔

(۵) پاکستان کی تعمیر و قیام میں بھارت کے مسلمانوں کا بہت بڑا دخل ہے، اس لیے پاکستان کا شرعی، اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم اس حق کی منت شناسی کے طور پر ہی وہ اپنے ہاں کے ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کرے۔

(۶) پاکستان نے اپنے آپ کو اسلامی حکومت کہا ہے، اس لیے اب اگر پاکستان میں کوئی جبر، ظلم یا نا انصافی کا واقعہ پیش آتا ہے تو اس سے اللہ، اللہ کے رسول، دین حق کی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے، اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کی پاداش کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

کہتے ہیں بدی سے بدی پیدا ہوتی ہے، اگر یہ سچ ہے تو اس سے کہیں زیادہ سچ یہ ہے کہ نیکی سے نیکی پیدا ہوتی ہے، پہلی چیز کا تجربہ کرتے ہوئے تین سال بیت گئے تو کیا اب ایک عظیم الشان اور نہایت ہولناک عالمگیر طوفان انقلاب کی آمد سے پہلے اپنی یک جانی حفاظت کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ دونوں حکومتیں نیکی سے نیکی کا بھی تجربہ کر دیکھیں۔

(برہان، دہلی۔ اگست ۱۹۵۰ء)

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

(از جناب مولانا سید محمد میاں صاحب مراد آبادی ناظم جمعیتہ علماء ہند)

”ذیل میں ہم اپنے فاضل و محترم دوست جناب مولانا کا وہ خط شائع کرتے ہیں جو موصوف نے برہان کے گذشتہ مقالہ ”پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت“ کو ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کی علمی اور دینی بصیرت و تفقہ کسی تعارف کی محتاج نہیں، اس لیے اس خط میں جو چند نقاط زیر بحث لائے گئے ہیں وہ کافی غور طلب ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ خط اس وقت ملا جب کہ مکتوب ایبہ بیماری کے باعث صاحب فراش ہے اس لیے نہ اس کا جواب لکھا جاسکا اور نہ برہان کے لیے وہ مقالہ ہی تیار ہو سکا جس کو اس اشاعت میں آنا تھا بشرط صحت آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کی جائے گی“

(ایڈیٹر)

محترم مولانا۔ دامت فیوضکم و عمت السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ،
مزاج گرامی۔

جناب کا مضمون میں نے کل ہوائی جہاز کی فرصت میں مطالعہ کیا۔ محترم مولانا۔ آپ نے اس مضمون سے اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ غور و فکر کی ایک سیل معین کر دی۔ بہت سی جزئیات کے لیے ایک صحیح اصول پیش کر دیا۔

اسلامی حکومت کی تعریف کر کے درحقیقت نواب زادہ لیاقت علی خان اور ان کی پارٹی پر بھی بہت بڑا احسان ہو گیا شاید یہ توجیہ ان کے سامنے بھی اس انداز سے نہ ہوگی۔ اسی طرح ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا بھی جواب دیا جاسکتا ہے۔ تقسیم کے وقت

اگر کوئی معاہدہ نہ بھی ہوا ہو تو نہرو لیاقت معاہدہ نے اقلیت کے آئینی اور دستوری حقوق پاکستان پر لازم کر دیے لیکن آپ کے مضمون کے مطالعہ سے ایک شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اور میری طرح خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔ آپ کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بحالت موجودہ اس بنا پر کہ جمعہ اور عیدین کی اجازت ہے، اور مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے، دارالاسلام ہے حالانکہ جس عبارت سے آپ استدلال کر رہے ہیں اس میں سخت حکم دلاہ امورنا موجود ہے۔

اس فقرہ کا جو ترجمہ آپ نے کیا ہے وہ بھی خلجان میں اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ درمختار وغیرہ کی بہت سی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے، اور اکابر علماء کے فیصلوں سے بھی یہ ہی ثابت ہے کہ جب تک مذہبی امور میں مسلمانوں کا بااختیار نظام نہ ہو۔ دارالاسلام نہیں ہے، اور اگر کسی ملک میں یہ بااختیار نظام نہ ہو تو اس کا قائم کرنا ضروری ہے اور اسی بناء پر درمختار میں غالباً باب قضاء میں یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایسا امیر بنائیں جو جمعہ قائم کر سکے اور نکاح وغیرہ کے معاملات انجام دے سکے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر اسی مسئلہ کو پیش کرتے رہے اور جمعیتہ علماء ہند کا مطالبہ نظام قضاء جس کو غالباً کلچرل اٹانمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہ بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں مسلمان حکام اور نمازوں کی آزادی انگریزی دور میں بھی تھی مگر اس زمانہ میں علماء نے ہندوستان کو دارالاسلام نہیں کہا۔ البتہ بھوپال اور حیدرآباد کو درمختار کی اس عبارت کے بموجب دارالاسلام تسلیم کرتے رہے۔

گویا۔ دارالاسلام کے لیے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ البتہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اندرونی معاملات ان کے دلاہ امور نواب کے حوالے کر دیے گئے ہیں تو وہ دارالاسلام ہو جائے گا۔ اس جرح کے بعد موجودہ

ہندوستان کی حیثیت کا سوال پھر باقی رہ گیا، دارالحرب یقیناً نہیں ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ محارب نہیں۔ مکہ کی مثال بھی صادق نہیں آتی، اور مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور یہودیوں کو ملا کر سیاسی وحدت قائم کر دی گئی تھی۔ مگر عدالت عالیہ۔ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل و انصاف تھا۔ اور اسی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے سپرد تھا۔ حبشہ میں مسلمان۔ متامن تھے۔ پناہ گزین تھے۔ حبشہ کو وطن نہیں بنایا اور اس دور پناہ گزینی میں جو حبشہ نے امداد کی اس کے عوض میں مسلمانوں نے بھی جنگ میں شاہ حبشہ کی فوجوں کی امداد کی بموجب۔ ”هل جزاء الا حسان الا احسان“ لہذا حبشہ پر بھی ہندوستان کو قیاس نہیں کر سکتے۔

اب ایک اہم خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی حیثیت معین کریں، کتب فقہ میں دوسری ”دار“ کا تذکرہ آتا ہے، دار الاسلام اور دارالحرب لیکن قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اور بھی ہوں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت جمعیتہ علماء ہند میں غالباً ”الدر المنقذ“ کے حوالہ سے ایک تیسرا دار بھی بیان فرمایا ہے یعنی دار الامن لیکن یہ کتاب مجھے ملی نہیں۔ اس کتاب کا صحیح نام تو خطبہ صدارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر جناب کے پاس نہ ہو تو احقر دہلی پہنچ کر لکھ دے گا مگر بہر حال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ دو باتیں اور بھی عرض کر دوں۔ ان دونوں سے احقر کو مسرت ہوئی۔ کیونکہ آج تک ان دونوں خیالات میں کسی کی تائید نہیں حاصل ہوئی تھی، آپ کی تحریر سے تائید حاصل ہو گئی۔

اول یہ کہ خلافت راشدہ خیر القرون سے اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ ایسے آدمی نہیں رہے تھے، احقر کا خیال بھی یہی ہے۔

بظاہر خلافت راشدہ کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے تمام ذمہ دار تقویٰ اور عبادت کے تربیت یافتہ اور صاحب بصیرت و تفقہ ہوں۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے جن کی تربیت کی تھی ان کا ایسا دور جس میں اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں ہوتا وہ کم و بیش تیس سال تک رہنے والا تھا۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی، آپ کے بعد نیت و امانت کی ترقی نہ ہوگی بلکہ تدریجی تنزل شروع ہو جائے گا۔ لہذا آپ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر ملک عضو شروع ہو جائے گا ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو طبعی حالات کے قیاس پر مبنی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ فیصلہ بہر ایک خلیفان کو ختم کر دیتا ہے کہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر۔ حضرت عثمان غنی رضی عنہ کی شہادت پر ختم ہو جاتے ہیں، البتہ حضرت شاہ صاحب بے شمار احادیث کی روشنی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کو بھی خلافت راشدہ ہی قرار دیتے ہیں البتہ خلافت راشدہ غیر منتظمہ۔ اور حضرت شاہ صاحب کے ارشادات کے مطابق خیر القرون کے علی الترتیب یہ تین درجے ہوتے ہیں۔

۱۔ دور نبوت۔

۲۔ خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوت۔

۳۔ خلافت راشدہ منتظمہ :- جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور کے بعد، امامت، خلافت یا دینی حکومت صحیح معنی میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ابتدائی دور کے ساتھ تحدید پر مجھے شبہ ہے۔

دوسری بات جس سے مجھے اطمینان ہوا۔ کہ آپ سے اس کی تائید حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ سستی کی رسم جو مسلمان بادشاہوں کے دور میں جاری رہی تو اس کا سبب مسلم حکام کی بے پرواہی اور بے اعتدالی نہیں تھی بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے رسم و رواج میں مداخلت کبھی بھی گوارا نہیں کی اگرچہ

احقر کے خیال میں اصولاً اُن کے لیے لازم تھا کہ وہ اس رسم کو بند کرتے۔ کیوں کہ یہ ایسا فعل ہے جو نہ صرف اسلام کی رو سے ناجائز ہے بلکہ اقوام عالم کے مسلمات کے خلاف ہے، اور جس طرح نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ ہوگی کہ مجوسی۔ ماں یا حقیقی بہن سے شادی کر سکے، اسی طرح سستی کی رسم بھی تھی۔ تاہم اگر اس کو ختم نہیں کیا گیا تو اس کا باعث ان کا پہی تخیل تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کوئی مداخلت نہ ہونی چاہیے۔

میں نے کافی وقت لے لیا۔ اور اپنا بھی اتنا ہی وقت صرف کر دیا مگر میرا خیال ہے کہ اس طویل تحریر میں جس تحقیق کی آپ سے درخواست کی ہے اگر وہ منظور ہوئی تو مجھے بھی فائدہ ہوگا اور عام مسلمانوں کو بھی۔ محترم مولانا عتیق الرحمن صاحب کی خدمت میں سلام پیش فرما دیجیے۔ بچوں کو دعا فرما دیجیے۔

(برہان، دہلی۔ جون ۱۹۵۰ء)

آزاد ہندوستان کا دستور اور مذہبی آزادی

" یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں اور نظریات پر قائم رہی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کا دستور جمہوریت اور نامذہبی اصولوں پر وضع کیا گیا۔ یہ دستور ہندوستان کے ہر باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے اور بلا اختلاف مذہب و ملت ہر ایک ہندوستانی کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر طبقہ کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقا و تحفظ و ترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں، جو اس سلسلے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں پر غور کریں کہ ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں اور ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے آثار و معابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کس طرح ملک کی تعمیر جدید میں اپنی اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں

(خطبہ صدارت جمعیت علماء ہند، حیدرآباد، ۱۹۵۱ء)

قرآن مجید میں جو دستور اور نصاب لکھی ہیں

یہ امر آئی ہے کہ اگرچہ یہ نصاب اور دستور
 تقریباً تمام پروردگار کے یہ ہے کہ اللہ کا رسول اور
 ناسی ہی اور ان پروردگار کی کتاب و حکم اور ان کے ہر نصاب
 کو ساری حقیقت دینا ہے اور بلا اختلاف و تفسیر و تفسیر ہر ایک
 پروردگار کے یہ ہے کہ وہ اللہ کے یہ ہے اور ہر ایک کو
 دینا ہے کہ وہ ہے **نصاب قرآن** اور ان کے ساتھ ان
 کے ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ اللہ کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک
 کے ساتھ ہم ہی اور ان کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک
 ہر ایک اور ان کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک
 خود کریں کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک
 نصاب، مذکورہ علوم و اسلامی اور ان کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک اور ان کے
 کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک
 اسلامی اور ان کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے یہ ہے کہ وہ ہر ایک

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ ساری باتیں

ہندوستان کی حیثیت

مولانا سید محمد امین

مولانا سید محمد امین علیہ الرحمہ نے ”علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے“ حصہ اول میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مسلکِ سیاسی کی وضاحت کے سلسلے میں جو نہایت مفید بحث فرمائی ہے۔ اس میں چند سوالات کے جوابات میں ہندوستان کی شرعی حیثیت بھی موضوع بنی ہے۔ یہ بحث اگرچہ بہت مجمل ہے لیکن بہت اہم ہے اور دیوبند کا مکتبہ فکر کی انقلابی جماعت کے خیالات کی صحیح ترجمانی اس مختصر تحریر سے ہوتی ہے۔ یہ تحریر اسی کتاب سے مقتبس ہے۔

سوالات :

- (۱) ہندوستان دارالہرب ہے یا دارالاسلام ؟
- (۲) کیا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جدوجہد ضروری ہے ؟
- (۳) آزادی وطن کی کیا صورت ہو ؟
- (۴) جانشینانِ ولی اللہ نے آزادی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا ؟
- (۵) کیا وطنی مطالبات اور ملکی مفاد کے لیے ہندوؤں کے ساتھ کانگریس میں شرکت جائز ہے ؟

جوابات :

نمبر ۱: سو سال کامل گزر گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہندوستان کے دارالہرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے، جہاد کا لائحہ عمل بنا چکے۔

تحریک حضرت سید صاحب کا تمام ہنگامہ برپا ہوا۔

مکت اسلامیہ کے ہزاروں عزیز نوجوان شہید ہوئے، سیکڑوں خاندانوں کے

چراغ گل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کا خونِ معرکہ ہندوستان کے چمپہ چمپہ کو خونِ شہداء سے رنگین کر چکا۔ ہزاروں نوجوان توپوں کے لقمے بنا دیے گئے۔ لاکھوں درخت وحشت ناک پھانسیوں کا نظارہ دیکھ چکے۔

یہ سب کچھ ہو چکا مگر انگریزی فتنہ اور یورپین دغل و فریب کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق اب بھی شبہ تھا۔

چنانچہ مولانا سعد الدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز سے استفتاء کیا۔

جس کے جواب میں حضرت امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا۔ جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی، اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی تو بازار کی چلنے والی چیز تصور کر کے اس کو ایسے بزرگ نے شائع فرمایا جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے، اور پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے ایک صفحہ کا بے معنی فتویٰ لگا کر محفل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

امام ربانی رحمت سے صفحہ کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطور نتیجہ فرماتے ہیں :

اب ہندوستان کی حالت پر	لکنوں حال ہندوستان خود غور
آپ خود غور فرمائیے کہ اس جگہ	فرماتے کہ اجراء سے احکام کفار
کفار و نصاریٰ کے احکام کا اجرا کس	نصاریٰ دریں جا بجا قوت و غلبہ
قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے اگر ایک	ہست۔ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کر دے کہ
ادنیٰ کلکٹر حکم کر دے کہ مسجدوں میں جماعت	در مساجد جماعت ادا نہ کیے۔
نہ ادا کریں تو کسی بھی امیر یا غریب کی	یہ سچ کس از امیر و غریب قدرت
مجال نہیں ہستی کہ مسجد میں جماعت ادا کر سکے۔	ندارد کہ ادا سے آں نماید۔

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں :

پہر حال تسلط کفار بر ہندوستان
 درجہ است کہ در پیمہ وقت
 کفار دار الحرب زیادہ ازین
 نمود۔ و ادائے مراسم اسلام
 از مسلمانان محض باجارت
 ایشان است و از مسلمان
 عاجزترین رعایا کے نیست
 ہنود را ہم رسوخ ست مسلمانان
 را نیست۔

بہر حال کفار کا تسلط ہندوستان
 پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی
 کفار کا کسی دار الحرب پر اس سے
 زیادہ غلبہ نہیں ہوتا۔ اور جو اسلامی
 رسومات اور شعائر مسلمان یہاں ادا
 کرتے ہیں وہ صرف ان کی اجازت سے
 کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ
 عاجز نہیں۔ ہنود کو بھی کسی قدر رسوخ
 حاصل ہے۔ مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔

نمبر ۱: ہندوستان جب کہ مسلمانوں کا ملک تھا اور انگریزوں نے اس کو غصب
 کیا اور دار الحرب بنایا تو انگریزوں کو نکالنا لامحالہ فرض ہوا۔ جو اب نمبر ۱ کے
 بعد اس پر بحث کی حاجت نہیں رہتی۔

نمبر ۲: یعنی آزادی وطن یا انگریزوں کے اخراج کی کیا صورت ہو، بیشک
 یہ مسئلہ قابل غور تھا اور زمانہ کی رفتار نے اس کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا
 تھا۔

صورت یہ ہے کہ جب تک ظاہری اسباب کی بناء پر اس درجہ قوت نہ
 ہو کہ فتح کی امید کی جاسکے۔ شرعی حیثیت سے اقدام کی اجازت نہیں دی
 جاسکتی۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز تک سرفروشیوں کی کثرت سامان فتح ہوا کرتی تھی
 لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلات حرب نے نوجوانوں اور سرفروشیوں
 کے بجائے آلات حرب اور فراہمی سرمایہ پر فتح و شکست کو منحصر کر دیا تھا۔
 علاوہ ازین ہندوستانیوں سے آلات حرب چھین کر ان کو فن سپہ گری سے

قطعاً نابلد کر دیا گیا تھا۔

نمبر ۴: لیکن ان تمام مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے ان حضرات نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دوسرا نقشہ جنگ تیار کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تنظیم کرتے ہوئے دیگر ممالک سے امداد حاصل کی جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔

نمبر ۵: پانچواں نمبر یہ کہ وطنی مطالبات اور ملکی ضروریات کے لیے کانگریس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟

یہ وہ مسئلہ ہے جو ۱۸۸۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک طے نہیں ہو سکا اور جب تک انگریزی شہنشاہیت ہندوستان پر مسلط ہے ممکن نہیں کہ اس قسم کے مسئلے طے ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ علماء دیانت داری کے ساتھ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مگر اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یعنی دارالہرب کو دارالاسلام پر قیاس کیا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جیٹا انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی فرماتی ہے۔

ہجرت کے بعد تک مکہ معظمہ دارالہرب رہا۔ آپ کی مقدس زندگی کا بیشتر حصہ اسی دارالہرب میں گزرا۔ ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے وقت سیرت مقدسہ کا پہلی حصہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

سیرت مقدسہ کی مبسوط اور مستند کتابوں پر عمیق نظر رکھنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قریش کی اندرونی رقابت نے کس طرح ظہور اسلام کے وقت قریش کو دو گروہ میں منقسم کر دیا تھا جن میں سے ایک گروہ جس کے لیڈر ابوطالب تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ حالانکہ اس کے بہت سے افراد آخر تک مسلمان نہیں ہوئے، کیا یہ غلط ہے کہ انگریزوں کے مقابلہ پر مسلمانان ہند کا ہندوؤں سے تعلق وہی نوعیت رکھتا ہے جو مسلمانان مکہ کا قریش کے اس گروہ

کے ساتھ تھا۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی پناہ میں نہیں تھے۔ کیا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابن دغنے کی پناہ نہیں لی۔ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ ابوطالب کی وفات کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں آئے۔ کیا اس عرصہ کے لیے قرآن پاک کے یہ احکام نہ تھے۔

تم اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر
 تمہارے رب کی جانب سے نازل
 کی جا رہی ہے اس کے سوا تمہارا
 کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے
 اعراض کرتے رہو۔

(الف) اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ
 إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَا
 إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ
 الْمُشْرِكِينَ۔

رب) اعراض کی تفسیر دوسری آیت میں وارد ہوئی۔

ان کی ایذا رسانی سے قطع نظر
 کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

دَعِ إِذًا هُمُ وَتَوَكَّلْ
 عَلَى اللَّهِ۔

اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور
 نماز کی پابندی کرو۔

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا
 الصَّلَاةَ۔

تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین
 اور کیا یہ غلط ہے کہ دارالہرب کے لیے یہ تعلیمات آج تک بدستور قائم ہیں۔
 منسوخ نہیں ہوتیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (حجۃ اللہ البالغہ) باب سیرۃ النبی
 صلی اللہ علیہ وسلم تفسیر القان۔ سیرت ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد وغیرہ۔ مزید
 توضیحات کے لیے ملاحظہ ہو؛ رسالہ جواز شرکت کانگریس وازالہ شکوک۔
 بہر حال دلائل کچھ بھی ہوں ہمیں اس وقت امام ربانی رحمہ اللہ کا فتویٰ پیش کرنا ہے
 دلائل پر بحث کرنا موضوع کلام سے خارج ہے۔

ہندوستان بالتحقیق دارالحرب ہے

مولانا رشید احمد گنگوہی کا آخری فتویٰ

گزشتہ صفحات میں اس فتویٰ کا آخری پیرا گراف جو خلاصہ کلام و فتویٰ پر مشتمل ہے۔ نقل کیا جا چکا ہے۔ فتوے کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ مکمل نقل کیا جائے۔ حضرت گنگوہی رح کا یہ فتویٰ فارسی زبان میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبند مرحوم نے کیا تھا اور ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳-۳۴ء) میں دیوبند سے "فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب ودارالاسلام" کے نام سے شائع کر دیا تھا، اور اب یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کے مجموعہ افادات عالیہ بہ عنوان "تالیفات رشیدیہ" ادارہ اسلامیات، لاہور (۱۹۸۷ء) میں شامل ہو کر شائع ہو گیا ہے۔ یہاں صرف اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا۔ فارسی متن اور حواشی بھی ترک کر دیے ہیں۔ فتوے کے اصلی فارسی متن اور اس پر محققانہ حواشی کے لیے تالیفات رشیدیہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ابوسلمان شاہ جہان پوری) سوال :- حضرات علماء کرام اور مفتیان اسلام کی خدمت میں عرض ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ اس پر موقوف ہیں کہ دارالاسلام اور دارالحرب میں امتیاز کیا جائے جیسا کہ حضرات علماء پر تحقیق نہیں۔

پس اس مسئلہ میں حضرات علماء عصر کیا فرماتے ہیں کہ بلاد ہندوستان جو آج کل ہر طرح سے نصاریٰ کے تسلط و حکومت میں ہیں۔ احکام شرعیہ میں ان کو دارالحرب قرار دیا جائے گا یا دارالاسلام۔ بینوا توجروا۔

الجواب :- پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ کبھی ملک اور کسی شہر کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس پر غلبہ اہل اسلام کا ہے یا کفار کا۔ بناء علیہ جو شہر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے وہ دارالاسلام کہلائے گا، جیسا کہ جامع الرموز میں ہے :

”دارالاسلام وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں
 کے امام کا حکم چلتا ہو، اور مسلمان اس
 میں مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جس
 میں مسلمان کفار سے اپنے جان و مال کا
 خوف رکھتے ہوں۔“

اور در مختار میں ہے :-

”سُبُلُ قَارِي الْهَدَايَةِ عَنِ
 الْبَحْرِ الْمَلْحِ مِنْ دَارِ الْحَرْبِ
 أَوَّلَ اسْلَامٍ أَجَابَ أَنَّهُ لَيْسَ
 مِنْ أَحَدِ الْقَبِيلَتَيْنِ لِأَنَّهُ
 لَا قَهْرَ لِأَحَدٍ عَلَيْهِ أَنْتَهَى“

”قاری الہدایہ سے سمندر کے متعلق دریا
 کی آبیاری کہ وہ دارالحرب میں داخل ہے یا دارالاسلام
 میں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ دونوں میں
 سے کسی میں بھی داخل نہیں کیونکہ اس پر کسی کا
 (مکمل) قبضہ نہیں ہے۔“

اس عبارت کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کسی ملک کے دارالاسلام یا
 دارالحرب ہونے کا مدار صرف اسلام یا کفر کے غلبہ پر ہے، اور اگرچہ سمندر کے بارے میں قول
 راجح یہی ہو کہ وہ دارالحرب میں داخل ہے، لیکن ہر ایسے مقام کو جو اہل اسلام و کفار
 دونوں کا برابر ورثہ میں مقہور ہو دارالاسلام ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ قاعدہ مشہور
 ”الاسلام یعلو ولا یعلیٰ“ (یعنی اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) اسی کا مقتضی
 ہے۔ مگر اس مقام کو دارالاسلام اسی شرط مذکور کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بعض حکام
 اسلام کا قبضہ اور تسلط اس جگہ ہو ورنہ محض اس بنا پر کہ اس ملک میں مسلمان آباد
 ہیں یا وہ کفار کی اجازت سے شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکتے ہیں اس ملک کو دارالاسلام
 نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ کسی ملک میں محض مسلمانوں کے آباد ہونے اور باذن کفار
 شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح کسی ملک میں کفار کا آباد
 ہونا یا شعائر کفر کا مسلمانوں کی اجازت یا ان کی غفلت سے وہاں ظاہر کرنا اس ملک
 کے دارالاسلام ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان دونوں صورتوں میں

غلبہ ان لوگوں کا نہیں پایا جاتا، اور مدار حکم غلبہ ہی ہے، محض وجود یا ظہور پر نہیں۔
 یہی وجہ ہے کہ کفار اہل ذمہ، دارالاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے آباد
 رہتے ہیں اور اپنے شعائر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر دارالاسلام اپنے حال پر
 دارالاسلام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح مسلمان دارالحرب میں جاتے ہیں، اور اپنے
 شعائر کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر صرف اتنی بات سے وہ ملک دارالحرب ہونے
 سے خارج نہیں ہو جاتا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ
 سے پہلے جب کہ مکہ مکرمہ دارالحرب تھا۔ عمرہ قضا میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت
 کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور جماعت و نماز و عمرہ وغیرہ شعائر اسلام کو
 اعلام کے ساتھ ادا فرمایا، اور اتنی بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ کفار کو مقہور و
 مغلوب کر سکتی تھی۔ چنانچہ (عمرہ قضا سے پہلے) غزوہ حدیبیہ میں اسی قدر لشکر کے ساتھ
 یہ عزم ہو چکا تھا کہ مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی جائے (مگر پھر جب واقعات کی تحقیق سے
 حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر غلط ثابت ہوئی تو اس عزم کو چھوڑ دیا گیا۔ الغرض
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس قدر لشکر اپنے ساتھ رکھتے تھے جو کفار مکہ
 کو مغلوب کر سکتا تھا) مگر چونکہ یہ (مکہ کا داخلہ) اور شعائر اسلام کا اظہار باذن کفار
 تھا اس لیے ان تین روزہ میں مکہ معظمہ کو حکم دارالاسلام نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ بدستور
 دارالحرب رہا۔ کیونکہ یہ قیام مکہ اور اظہار اسلام اجازت کی بنا پر تھا غلبہ کی بناء
 پر نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ اس بات میں یہ ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو
 اور دارالاسلام وہ جو مقہور اہل اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار کے
 لوگ بھی بدوں غلبہ و قہر کے آباد ہوں (مثلاً دار الکفار میں کفار یا دار الحرب میں مسلمان
 بلا غلبہ و قہر آباد ہوں)۔

اور جس ملک پر دونوں فریق (اہل اسلام اور کفار) کا تسلط ہو وہ بھی دارالاسلام
 ہی سمجھا جائے گا۔ اس قاعدہ اور اصل کلی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا چاہیے۔

کیوں کہ تمام مسائل متعلقہ اسی اصل سے نکلتے ہیں، اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصل کلی پر دائر ہیں۔

دارال الحرب پر مسلمانوں کا قبضہ :

اس کے بعد ایک اور بات سن لینا چاہیے وہ یہ کہ جو ملک اصل سے دارال الحرب و دارالکفر تھا۔ پھر مسلمانوں نے اُس پر غلبہ پایا، اور احکام اسلام کو وہاں جاری کر دیا۔ اُس کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ وہ ملک اب دارالاسلام ہو گیا۔ کیوں کہ اس میں مسلمانوں کا غلبہ اور قہر متحقق ہو گیا۔ اور اگرچہ کسی حیثیت سے کفار کا بھی کچھ غلبہ وہاں باقی ہو۔ تاہم بحکم الاسلام یعلوا ولا یعلیٰ یہ ملک باتفاق دارالاسلام ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے اس کو واضح کر دیا گیا ہے، اور اس کے بعد یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں کا داخلہ اور احکام اسلامیہ کا اجراء اس ملک میں غلبہ کے ساتھ نہ ہو تو اس ملک کے دارال الحرب ہونے میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ورنہ جرمن اور روس اور فرانس اور چین وغیرہ) جو نصاریٰ یا بت پرستوں کے قبضہ میں ہیں سب کے سب دارالاسلام کہلانے کے مستحق ہو جائیں گے، اور ساری دنیا میں کہیں دارال الحرب کا نام و نشان نہ رہے گا۔ کیونکہ تمام ممالک کفار میں مسلمان باذن کفار احکام اسلامیہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تمام دنیا کو بحالت وجودہ دارالاسلام قرار دینا بالکل باطل ہے۔

دارالاسلام پر کفار کا قبضہ :

اور جو ملک یا شہر دارالاسلام تھا پھر سب پر کفار نے غلبہ کر لیا۔ اگر وہاں سے اسلام کا غلبہ بالکل زائل ہو گیا تو وہ ملک اب دارال الحرب کے حکم میں ہو گیا۔ اور اگر کفار کا غلبہ تو ہو مگر بعض حیثیات سے اُس میں اسلام کا غلبہ بھی باقی ہے تو اس کو اب بھی دارالاسلام ہی کہا جائے گا نہ کہ دارال الحرب۔ اتنی بات پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ البتہ اس میں کلام ہے کہ غلبہ اسلام کے بالکل زائل ہو جانے کی حد کیا ہے۔ سو اس میں صاحبین یعنی امام ابو یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جب کفار نے

علی الاعلان احکام کفر کو جاری کر دیا، اور مسلمان اپنے غلبہ و قدرت سے بلا اجازت کفار احکام اسلام کو جاری نہیں کر سکتے تو غلبہ اسلام بالکل مرتفع ہو گیا۔ اور یہ ملک بحکم دار الحرب ہو گیا۔ البتہ اگر دونوں فریق یعنی اہل اسلام و کفار اپنے اپنے احکام کو اپنے اپنے غلبہ اور قدرت سے علی الاعلان جاری کرتے ہوں تو ابھی تک اُس سے غلبہ اسلام بالکل زائل نہیں ہوا، اور اس ملک کو دار الحرب نہیں کہہ سکتے۔ اور جب کہ کفار اپنے احکام کو غلبہ و تسلط کے ساتھ علی الاعلان جاری کرتے ہوں، اور مسلمان بلا اُن کی اجازت کے اپنے احکام علی الاعلان جاری رکھنے پر قدرت نہ رکھیں تو وہاں غلبہ اسلام بالکل مرتفع اور زائل ہو گیا۔ اور قیاس اسی کا مقتضی ہے جو حضرات صاحبین فرماتے ہیں، کیوں کہ جب کفار اس طرح مسلط ہو گئے کہ احکام کفر اپنے غلبہ سے علی الاعلان جاری کرتے ہیں اور اہل اسلام اس قدر عاجز و مغلوب ہو گئے کہ اپنے احکام جاری نہیں کر سکتے اور احکام کفر کو جو کہ اسلام کے لیے عار اور ننگ ہیں دور نہیں کر سکتے۔ تو اب کون سا درجہ اسلام کا باقی ہے کہ اس ملک کو دارالاسلام کہا جائے۔ بلکہ اس صورت میں تسلط اور غلبہ کفار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور یہ ملک بالفعل دار الحرب ہو گیا۔ آئندہ جو کچھ ہونا مقدر ہے وہ ہو رہے گا۔ مگر اس وقت اس کے دار الحرب اور مقہور کفار ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا اور قدیم دار الحرب کی طرح کفار کا مغلوب و مقہور ہو گیا جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ فرمایا ہے کہ جب تک غلبہ اسلام کے آثار میں سے کوئی چیز پائی جاتی ہے، یا استیلاء کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا زائل کر دینا مشکل نہ ہو۔ اس وقت تک اس ملک پر دار الکفر ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہیے۔ اسی بناء پر امام اعظم نے اس ملک کے دار الحرب ہونے کے لیے دو شرطیں زائد فرمادیں۔

شرط اول :- ایک یہ کہ جس دارالاسلام پر کفار نے تسلط کیا ہے وہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہو۔ اس کے اور دار الحرب کے درمیان کوئی ملک یا شہر دارالاسلام

حائل نہ ہو۔ کیوں کہ اس طرح دار الحرب کے ساتھ اتصال اور دار الاسلام سے انقطاع کی وجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب یہ ملک پوری طرح سے کفار کے قبضہ میں چلا گیا اور تسلط اور غلبہ ان کا مستحکم ہو گیا، اور ان کے ہاتھوں سے چھڑانا اس کا مشکل ہو گیا۔

اور یہ مسئلہ اس کی نظیر ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کے مال پر استیلاء و تسلط کر لیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مال کو اپنے ملک میں لے جا کر مکمل قبضہ کر لیں۔ اس صورت میں تو یہ مال ان کی ملک میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہنوز اس مال کو اپنے ملک میں نہیں لے گئے اور احراز و قبضہ مکمل نہیں ہوا تو اس وقت تک اس کے مالک کی ملک اس سے منقطع نہیں ہوئی، اور کفار کی ملک میں داخل نہیں ہوا۔ جیسا کہ تمام کتب فقہ میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے۔ ہدایہ میں ہے:

”وَإِذَا غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْوَالِنَا
أَحْرَزُوا بِهَا بَدَارَ هِمِّ
مَلِكِهَا۔ اُنْتَهَىٰ“

اور فرمایا ہے:-

”غیران الاستیلاء ولا یتحقق
الابل الاحراز بالدار لانہ
عبارة عن الاقتدار علی
المحل حالاً ومالاً“

”مگر استیلاء کفار اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا
جب تک وہ ان اموال کو اپنے ملک میں نہ
لے جائیں کیونکہ استیلاء کی حقیقت یہ ہے کہ
کسی محل پر قبضہ بالفعل بھی ہو اور (بظاہر
اسباب) وہ قبضہ باقی بھی رہ سکے“

پس اسی طرح اگر کسی زمین یا کسی شہر پر کفار کا استیلاء و مکمل تسلط اس طرح ہو گیا کہ اس کا احراز دار الحرب کے ساتھ ہو گیا، اور احراز کی صورت زمین کے بارہ میں یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا اتصال دار الحرب کے ساتھ ہو جاوے اور دار الاسلام سے منقطع ہو جاوے تو اس صورت میں وہ ملک بالکلیہ مقہور کفار ہو گیا، اور جب تک ایسا نہ ہو

تو اس پر استیلاء اہل اسلام باقی سمجھا جائے گا۔ اگرچہ استیلاء و تسلط ضعیف ہی ہو، اور بحکم الاسلام یجوز ولا یعلیٰ“ اس کا مقتضی یہ ہوگا کہ یہ ملک دارالاسلام باقی رہے۔ پس خلاصہ اس شرط کا بھی وہی غلبہ کفار اور مغلوبیت اہل اسلام ہے جو ابتراء میں بطور قاعدہ کلیہ کے بیان کر دیا گیا ہے۔

شرط دوم: امام اعظم کے نزدیک یہ ہے کہ حاکم اسلام نے جو امان مسلمانوں کو بسبب اسلام کے اور کفار رعایا کو بسبب ذمی ہونے کے دے رکھا تھا وہ امان زائل ہو جاوے کہ کوئی شخص اس سابقہ امان کی وجہ سے اب اپنے جان و مال پر مامون نہ رہے۔ یعنی جیسا کہ حاکم مسلم کے امن دے دینے کی وجہ سے سب بے خوف تھے کسی کو اس کی مجال نہ تھی کہ کسی کے جان و مال پر ظلم کرے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا امن بدون حاکم مسلم کے غلبہ اور قوت و شوکت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اب یہ امان باقی نہ رہے، بلکہ بے کار ہو جاوے، اور باعث امن صرف وہ امان ہو جو غالب آنے والے کفار اپنے قانون کے موافق دیں۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک حاکم مسلم کے امن کی وجہ سے موذی کا خوف رفع ہوتا رہے تو غلبہ و شوکت اس حاکم مسلم کا باقی سمجھا جائے گا۔ اور جب یہ کچھ باقی نہ رہے بلکہ کافر متغلب کے امن ہی پر نظر رہ جائے تو امان اول زائل ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علی الاعلان اجراء سے احکام کفر کے بعد جب یہ دو شرطیں بھی پائی جائیں، اس وقت من کل الوجوہ غلبہ کفار مانا جائے گا، اور غلبہ اہل اسلام کو زائل و مرتفع سمجھا جائے گا۔ اس وقت ناچار اس ملک پر دارالہرب ہونے کا حکم کیا جائے گا۔

اہل عقل کو اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس قول کا مدار بھی صرف قہر و غلبہ پر ہے، جس کی توضیح ابتداء میں بضمن قاعدہ کلیہ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد فقہاء کی روایات و عبارات سننی چاہیے کہ ان میں سے بعض سے بندہ کی تشریح مذکور کی دلیل حاصل ہوگی، اور بعض سے اس مسئلہ کے متعلق

روایات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

عالمگیر میں ہے :-

قال محمد فی الزیادات انما
 یصیر دار الاسلام دار الحرب
 عند ابي حنینة بوجوب احدھا
 اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتہار
 وأن لا یحکم فیہا بحکمہ الاسلام
 والثانی ان تكون متصنة بدار
 الحرب لا یتخلل بینہما بلدة
 من بلاد الاسلام. الثالث
 ان لا یبقی مسلم او ذمی امانا
 بامانه الاول الذی کان ثابتا
 قبل استیلاء الکفار للمسلم
 باسلامہ وللذی بعقد الدامة۔
 وصورة السئلة علی ثلثة اوجہ
 اما ان یغلب اهل الحرب
 علی دار من دورنا او امرت
 اهل مصر وغلبوا واجروا
 احکام الکفر او نقض
 اهل ذمة العهد وتغلبوا
 علی دارهم ففی کل هذا
 لا تصیر دار حرب الا بثلث
 شرائط۔ وقال ابو یوسف

”امام محمد نے زیادات میں فرمایا ہے کہ امام
 ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دارالاسلام
 کا دارالحرب ہونا چند وجوہ پر ہے۔ ایک یہ کہ احکام
 کفر کا علی الاعلان جاری کرنا اس طور پر کہ اسلام کے
 احکام حکم نہ رہیں (یعنی ان کے مطابق فیصلے نہ کیے جائیں)،
 اور دوسرے یہ کہ وہ دارالحرب کے ساتھ
 متصل ہو جاوے۔ ان کے درمیان کوئی
 شہر دارالاسلام کا حائل نہ ہو۔ تیسرے یہ
 کہ کوئی مسلمان اور کوئی ذمی کافر اپنے
 اُس امان سابق کی ساتھ مامیون و محفوظ
 نہ رہ سکے جو اُس کو غلبہ کفار سے پہلے
 بحیثیت مسلمان ہونے کے یا بحیثیت عہد
 ذمہ کے حاصل تھا اور صورت دارالحرب
 بننے کی تین ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرب
 ہمارے دارالاسلام پر غالب آجائیں دوسرے
 یہ کہ (معاد اللہ) کسی شہر کے مسلمان مرتد
 ہو کر شہر پر غالب آجائیں اور احکام کفر جاری
 کر دیں۔ تیسرے یہ کہ ذمی کافر جو مسلمانوں
 کی رعایا بن کر رہتے تھے، عہد شکنی کر کے
 باغی ہو جاویں اور دارالاسلام پر غالب آ
 جائیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں دارالاسلام

اس وقت تک دار الحرب نہ ہوگا، جب تک
تین شرطیں (مذکورہ) نہ پائی جاویں۔ اور
امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک
شرط متحقق ہونے سے دار الحرب کا حکم کر دیا
جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ احکام کفر
کو علی الاعلان جاری کر دیں اور قیاس
اسی کا مقتضی ہے۔ آہ

رحمة الله عليه ومحمد
رحمة الله عليه بشرط
واحد لا غير وهو
اظهار احكام الكفر
وهو القياس - انتهى

اور جامع الرموز میں ہے :

”لیکن دارالاسلام کا دار الحرب ہو جانا سو یہ
امام اعظمؒ کے نزدیک تین شرطوں پر موقوف
ہے، ایک ابتداء احکام کفر علی الاعلان اس
طرح کہ حکام وقت کفار کے حکم کو جاری کریں
اور لوگ مسلمان قاضیوں کی طرف مراجعت نہ
کر سکیں جیسا کہ بحر الرائق میں مذکور ہے، دوسرا
اس کا دار الحرب کے ساتھ ایسا متصل ہو جانا
کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں
حائل نہ رہے جس سے مسلمانوں کو مدد پہنچ
سکے“

فاما صيروتها دار الحرب
فعندها بشرائط احداها اجراء
احكام الكفر اشتهاً اباي
يحكم الحاكم بحكمهم
ولا يرجعون الى قضاة
المسلمين كما في البحر و
الثاني اتصال بدار الحرب
بحيث لا يكون بينهما بلدة من
بلاد الاسلام ما يلحقهم
المدد منها الخ

جامع الرموز کی اس روایت سے دو امر واضح ہوئے، اول یہ کہ احکام اسلام کے
جاری کرنے سے مراد یہ ہے کہ غلبہ اور قوت کے ساتھ احکام اسلام جاری کیے
جائیں (نہ کہ مطلقاً ادا سے جماعت و جمعہ باذن کفار) کیوں کہ جامع الرموز کی عبارت میں
ہے : يحكم بحكمهم ولا يرجعون الى قضاة المسلمين - یعنی قضاة مسلمین
کو کسی قسم کی شکوت وقعت نہ رہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کر سکیں۔ اسی طرح

مسلمانوں کا دارالحرب میں احکام اسلام کا جاری کرنا اسی صورت میں اس کو دارالاسلام بنا سکتا ہے جب کہ یہ اجرا اور احکام علی الاعلان اپنے غلبہ و تسلط کے ذریعہ ہو جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

پہر حال حکم اسلام اور حکم کفر دونوں بطریق غلبہ معتبر ہیں نہ کہ محض ادا بطریق اظہار۔ دوسری بات جامع الرموز کی عبارت سے یہ مستفاد ہوئی کہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی ہونٹ شرط امام صاحب کے نزدیک ضروری ہے، اس کا مطلب بھی وہی قوت و غلبہ ہے۔ کیونکہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے۔ بخلاف اُس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں پہنچنے کا احتمال قریب ہے۔ اس لیے ابھی تک قوت اسلام کو باقی سمجھا جائے گا۔

اور خزانۃ المفیتین میں ہے کہ کوئی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں احکام کفر علی الاعلان جاری نہ ہو جائیں، اور وہ ملک دارالحرب کے ساتھ متصل نہ ہو جائے کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی شہر بلاد مسلمین میں سے باقی نہ رہے، اور یہ کہ کوئی مسلمان یا ذمی رعایا امان سابق کے ساتھ اب مامون و محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ ہر مسلمان اور ذمی کو اس ملک میں بسر کرنا بغیر امان دینے کفار کے نہ ہو سکے۔ الخ

اور قتالہ بنمازیہ میں ہے سید امام فرماتے ہیں کہ آج کل جو شہر کفار کے قبضہ میں ہے بلاشبہ وہ ابھی تک دارالاسلام ہیں کیوں کہ ان میں احکام کفر ظاہر نہیں ہوئے بلکہ قضاة و حکام وہاں مسلمان ہیں۔ تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ عبارت مذکورہ میں ان شہروں کے دارالاسلام ہونے پر یہ دلیل لائے ہیں کہ حکام و قضاة وہاں مسلمان ہیں جس کی وجہ سے احکام اسلام ان میں بدستور سابق باقی ہیں۔ دلیل میں یہ نہیں فرمایا کہ لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں۔ کیوں کہ اجرا سے احکام سے مراد وہی اجرا ہے جو بطور غلبہ و شوکت کے ہو، نہ یہ کہ اپنے دین کے مراسم و شعائر

کو حاکم کافر کی رضا و اجازت سے ادا کیا جائے۔ اور درمختار میں ہے:

”معراج الدرایہ میں بسوط سے نقل کیا ہے کہ وہ شہر جو کفار کے قبضہ میں ہیں، دارالاسلام ہیں۔ دارالحرب نہیں کیوں کہ انھوں نے ان شہروں میں احکام کفر جاری نہیں کیے بلکہ وہاں ایسے حکام اور قاضی موجود ہیں جن کو مسلمانوں نے منتخب کر کے حاکم بنایا ہے اور وہ ان کی بضرورت و بلا ضرورت اطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر ایسا شہر جس میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی والی مقرر ہو اُس کے لیے اقامت جمعہ و شعائر اسلامیہ اور حدود و قصاص اور احکام و قضاة کا مقرر کرنا سب جائز ہیں۔ کیوں کہ ان پر امیر مسلم حاکم ہے اور اگر خود کفار ہی نے کسی مسلمان کو حاکم بنا دیا تب بھی مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ اُس کی زیر حکومت جمعہ وغیرہ قائم کریں، اور مسلمانوں کے اتفاق و رضی سے قاضی بن سکتا ہے۔ اور (دارالحرب کے) مسلمانوں پر واجب ہے کہ کوئی والی مسلم تلاش کریں (اور اپنے معاملات کا رجوع اس کی طرف کریں) انتہی۔“

اور اسی معراج الدرایہ میں ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ملک شام میں جو پہاڑ ”ایتم اللہ“ اور اس کے متعلقہ بعض شہر ہیں سب کے سب بلاد اسلام ہیں کیوں کہ ان کے حکام اگرچہ قوم دروز یا نصاریٰ ہیں لیکن وہ سب ہمارے مسلم حکام کے تابع ہیں اور ان کی طرف سے قضاة و حکام مقرر ہیں، اور چاروں طرف سے بلاد اسلام ان کے اس طرح محیط ہیں کہ جب ہمارے حکام و اولوالمرحہ ہیں تو وہاں اپنے احکام نافذ کر سکتے ہیں۔ انتہی۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہو گیا کہ غلبہ کفار کے بعد کسی ملک کے دارالاسلام باقی رہنے کے لیے جو اجراء احکام اسلام شرط ہے، اس سے یہی مراد ہے کہ بطریق غلبہ و شوکت احکام اسلام جاری ہو سکتے ہوں۔ اسی طرح دارالحرب میں احکام اسلام کا اجراء جب اُس کے دارالحرب ہونے کو زائل کر سکتا ہے جب کہ یہ اجراء سے احکام بطریق غلبہ و قوت ہونہ یہ کہ دارالحرب کا حاکم اپنی اجازت سے احکام اسلام جاری کر دے۔

حاصل یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک مذکورہ سابقہ تین شرطوں سے اور صاحبین رحمہ کے نزدیک شرط واحد یعنی اجراء احکام اسلام سے منقصود ایک ہی چیز ہے، یعنی وجود غلبہ و قوت اگرچہ بعض وجوہ سے ہو۔ لیکن علماء اسلام میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی شخص ان کی صریح اجازت سے یا ان کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دارالاسلام ہو جائے گا۔ حاشا وکلا۔ کیونکہ ایسا خیال بالکل تفقہ سے دور ہے۔

اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) مستحقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس قوت و غلبہ کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ کلکٹریہ حکم کر دے کہ مساجد میں جماعت ادا نہ کرو تو کسی امیر و غریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے۔ اور یہ جو کچھ ادا سے جمعہ و عیدین اور عمل (بعض) قواعد شرطیہ پر جو کچھ ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے کہ انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب میں آزاد ہے، کسی کو اس سے مزاحمت کا حق حاصل نہیں۔

اور سلاطین اسلام کا دیا ہوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا اب اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا ہوا تھا آج بھی ہم اسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے، اور اسی نصاریٰ کے دیے ہوئے امن کے ذریعے تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اتصال بدار الحرب سویہ ممالک و اقالیم عظیمہ کے لیے شرط نہیں بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لیے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہے، اور اگر کوئی کہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں مگر حاشا وکلا یہ بالکل صحیح نہیں بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے، بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامان جنگ کو چاہتا ہے۔ بہر حال تسلط کفار کا ہندوستان پر اس درجہ میں ہے کہ کسی وقت

بھی کفار کا تسلط کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ محض اُن کی اجازت سے ہے، ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز رعایا کوئی نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی ایک درجہ کارسوخ حکومت میں حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔ البتہ ریاست ٹونٹ اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوب کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں، ان کو دارالاسلام کہا جاسکتا ہے جیسا کہ درمختار وغیرہ کی روایات سابقہ سے مستفاد ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

بندہ رشید احمد گنگوہی

الحمد للہ والمنتہ کہ رسالہ دارالحرب کا ترجمہ اردو تمام ہوا، حق تعالیٰ اس کو بھی اصل کے ساتھ مقبول و نافع فرمائے آمین۔ والحمد للہ بعزته و جلالہ تتم الصالحات۔

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

